ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ ۸ روپیہ ششماہی ۴ روپیہ
ہندوستان سے باہر صرف سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا ۱۲ شلنگ

نگار

شاہی چندہ دینے والوں کا جنوری نمبر
بدون اضافۂ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا

THE NAWAB SALAR JUNG PUBLIC LIBRARY
لائبریری
RAMPUR STATE.

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۳۴	فہرست مضامین دسمبر ۱۹۳۸ء	شمارہ ۶

ملاحظات ---------- اڈیٹر ---------- ۴
نظیر اکبرآبادی کی غزل گوئی ---------- لطیف الدین احمد اکبرآبادی ---------- ۹
کتابوں کی یونیورسٹی ---------- سید محمد عبدالعلیم ---------- ۳۷
مکتوبات نیاز ---------- اڈیٹر ---------- ۴۳
سیاسیات یوروپ ---------- اڈیٹر ---------- ۴۸
آمر جرمنی کی داستانِ عشق ---------- خواجہ احمد فاروقی بی۔اے ---------- ۵۳
باب الاستفسار ---------- اڈیٹر ---------- ۵۷
منظومات ---------- نبی احمد۔ سلام۔ وجد۔ کاوش۔ کیفی۔ نعیم ---------- ۶۰
اسلامی ہند ---------- اڈیٹر ---------- ۲۵۹

اصلی برقی قوام (تمباکو خوردنی قیمتی فی تولہ ۴ عہ) جو قطعاً نزلہ نہیں پیدا کرتا شیخ خورشید علی پرفیومر نظیر آباد لکھنؤ کے پتہ سے ملے گا

ملاحظات

عالم اسلامی کا حادثۂ عظیم

وہ شخص جس کا نام ماں باپ نے مصطفٰے رکھا تھا، لیکن مدرسہ میں پہونچکر اپنے ذہنی امتیاز کی وجہ سے مصطفٰے کمال ہوگیا، جو درۂ دانیال کے معرکہ کے بعد مصطفٰے کمال پاشا کہلایا، جس نے ۱۹۲۱ء میں یونانیوں کو شکست دیکر قوم سے غازی مصطفٰے کمال پاشا کا لقب حاصل کیا اور جو آخر میں ان تمام امتیازات سے بلند تر ہوکر صرف اتاترک کہلایا، وہ آج دنیا سے منھ موڑکر عالم اسلامی کو حد درجہ سوگوار و ملول چھوڑ گیا ہے۔

آسماں راحق بود گر خوں بگریہ بر زمیں

کمال اتاترک اس دور کے انسانوں میں ایک معجزہ کی حیثیت سے ظاہر ہوا اور تھوڑی سی فرصت میں وہی سب کچھ کرگیا جو ایک "مردِ صاحبدل" کرسکتا ہے۔ ترکی قوم زوال و انحطاط کی جس منزل پر پہونچ گئی تھی وہ اسکے عالم احتضار کی منزل تھی اور کوئی صورت اس کے جانبر ہونے کی باقی نہ تھی، لیکن کسے خبر تھی کہ قدرت سالونیکا کے ایک معمولی سپاہی زادہ سے کارِ مسیحائی لینے والی ہے اور ٹھیک اسوقت جبکہ سرزمین ترکی کا ذرہ ذرہ وقف مایوسی ہوچکا تھا امیدوں کا نیا آفتاب طلوع ہوگا اور وہ بستی جو صدیوں سے محوِ خواب تھی دفعتاً بیدار ہوجائے گی۔

کمال اتاترک نے اپنی عسکری زندگی اسوقت شروع کی جب سلطنتِ ترکی کا شیرازہ درہم برہم ہوچکا تھا اور نوجوانانِ اتحاد و ترقی نے جنگِ عظیم کے سلسلہ میں جرمنی کی طرفداری کا غلط فیصلہ کرکے اپنے ہاتھ سے اپنی گردن پر چھری پھیر لی تھی۔ مصطفٰے کمال، انور بے کی اس پالیسی کا سخت مخالف تھا اور وہ اس کو خودکشی کہتا تھا، لیکن اُسوقت تو ساری دنیا اس کی دشمن تھی، خود انبارِ وطن اس کے مخالف تھے، ترکی کا ذرہ ذرہ اس سے برہم تھا، لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری، اور چند خستہ حال ترک سپاہیوں کی مدد سے چناق میں برطانوی فوج کے چھکے چھڑا دئے اور جب سب سے آخر میں یونانیوں کو اس نے سرزمین ترکی سے نکالا ہے تو لائڈ جارج جن کے اشارہ سے یونان نے یہ سب کچھ کیا تھا، حیرت زدہ ہوکر رہ گیا۔

قوموں کی تعمیر کرنے والے دنیا میں اور بھی ہوئے ہیں، لیکن مصطفےٰ کمال نے اس قوم کو قوم بنایا جو اپنی اجتماعی حیثیت بالکل کھو بیٹھی تھی اور اسقدر جلد کہ عقل انسانی باور نہیں کر سکتی۔ ۱۹۱۹ء میں ترکی کی شکستگی و درماندگی کا یہ عالم تھا کہ برطانیہ اس کو اپنی سیادت میں لینے کی تمام طیاریاں کر چکا تھا، لیکن تین سال نہ گزرے تھے کہ ۱۹۲۲ء میں لاسین کے مقام میں اتحادیئین کا ہاتھ پکڑ کر مصطفےٰ کمال نے وہی شرائط لکھوائے جو وہ چاہتا تھا اور ایشیا کوچک میں پھر وہی ہلالی جھنڈا لہرانے لگا، جس کی حفاظت کے لئے ترکی قوم اپنے لاکھوں فرزندوں کا خون بہا چکی تھی۔

کمال اتاترک کی غیر معمولی فراست و فطانت ثابت کرنے کے لئے صرف یہی ایک واقعہ کافی ہے کہ اس نے سب سے پہلے خلافت کا خاتمہ کیا اور تشخص پرستی کی اس دیرینہ روایت کو مٹا کر رکھدیا جس نے تعلیمات اسلامی کے بالکل خلاف نہایت مکروہ قسم کی ملوکیت قایم کر رکھی تھی۔ لیکن اس نے صرف اسی پر قناعت نہیں کی، بلکہ قیام خلافت کے سلسلہ میں جتنے مہالک جراثیم وہاں پیدا ہو گئے تھے، ان سب کو اس نے ہلاک کر ڈالا۔ مساجد و خانقاہ کو علماء و مشایخ کے وجود سے پاک کیا، مذہبی اوقاف کو جو مولویوں کی شکم پری کا ذریعہ تھے ختم کر دیا، تعدد ازواج کو ناجایز قرار دیا، عورتوں کو چار دیواری سے نکالکر آزادی کی فضا میں مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کا موقعہ دیا، رسم خط اور لباس بدل کر ممالک یورپ کے ساتھ سیاسی مساوات کا جذبہ لوگوں میں پیدا کیا، تعلیم کو عام اور مفت کر کے قدامت پرستی کی تاریکی کو مٹایا، اپنی زبان کو تمام اس متصنع و بوسیدہ لٹریچر سے پاک کر دیا جو مذہب کے نام سے واہمہ پرستی پھیلاتا تھا، صنعت و حرفت، زراعت و تجارت کے لئے نئی نئی راہیں کھولدیں اور جدید پایۂ تخت (انقرہ) تعمیر کر کے ترکی تاریخ کو نئی بنیاد پر استوار کرنا شروع کیا۔

حیرت ہوتی ہے کہ کمال اتاترک بارہ سال کی مختصر سی مدت میں وہ سب کچھ کیونکر کر سکا جو صدیوں میں بھی انجام کو نہیں پہونچتا اور تنہا کس طرح وہ اتنے بڑے کام کو پورا کر سکا جو اجتماعی قوت سے بھی اس خوبی کے ساتھ پورا نہیں ہو سکتا۔ دنیا جو چاہے کہے لیکن میں اسے معجزہ کہتا ہوں اور کمال اتاترک کو "صاحبِ معجزہ" ہی سمجھ کر اس کے مافوق الفطرت قوا، ذہنیہ کے سامنے سرِ عقیدت جھکاتا ہوں۔

کمال اتاترک اب نہیں ہے، لیکن اس کے کارنامے ہمیشہ باقی رہیں گے: اس کا جسم فنا ہو گیا لیکن اسکی پیدا کی ہوئی روح کبھی فنا نہ ہوگی۔ وہ اس زمانہ کا بطل اعظم تھا، اس دور کے ترکوں کا پیغمبر تھا، گمراہ قوموں کے لئے مشعل ہدایت تھا اور وہ سب کچھ تھا جو انسان کو "نیم خدا" بنا دیتا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی اور آلۂ مکبر الصوت

آلۂ مکبر الصوت، لوڈ اسپیکر (Loud Speaker) کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے آواز کئی گنا بلند ہو کر دور و نزدیک ہر جگہ پہونچ سکتی ہے اور مولانا اشرف علی صاحب کو آپ جانتے ہی ہیں، تھانہ بھون کے وہ عالم و

بزرگ ہیں جنھوں نے بہشتی زیور اور بہشتی گوہر لکھ کر عوام میں بہت شہرت حاصل کر لی ہے۔

آپ کی اور خصوصیات یہ ہیں کہ علم تفسیر و حدیث میں بھی آپ کو ملکہ راسخہ حاصل ہے اور آپ کے مریدوں کا بہت بڑا حلقہ ہندوستان کے ہر گوشہ میں پھیلا ہوا ہے۔ آپ کے پاس مسایل فقیہہ و غیر فقیہہ کے متعلق سیکڑوں خطوط روزانہ آتے ہیں اور آپ ان کا جواب دینے میں ہمیشہ اس تفقہ فی الدین سے کام لیتے ہیں جو دوسرے علماء میں کمتر پایا جاتا ہے اور فہم انسانی سے بیشتر دور ہوتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں آپ سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ:-

"آلہ مکبر الصوت" کے ذریعہ سے خطیب کی آواز کو تمام سامعین تک پہونچانا جایز ہے یا نہیں؟"

اس کا جو جواب مولانا نے دیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

"ہر ایسی مباح چیز کا استعمال جس میں کسی مفسدہ کا احتمال ہو ممنوع ہے، چونکہ خطیب کی آواز کا سامعین بعید تک پہونچانا شرعاً غیر ضروری ہے اور اس آلہ کے استعمال میں احتمال فساد ہے اور لہو و لعب کی صورت پیدا ہو سکتی ہے اس لئے اس کا ترک لازم ہے۔ پھر یہ تو اس وقت ہے جب خطیب سے مراد مطلق واعظ و لکچرار ہو لیکن اگر اس سے مراد جمعہ و عیدین کا خطیب ہے تو اس وقت چونکہ آواز کا سننا ضروری نہیں ہے اس لئے اس آلہ کو مسجد میں داخل کرنا احترام کے خلاف ہے اور تشبہ ہے مجالس غیر مشروعہ کے ساتھ"

اسی کے ساتھ مولانا نے ایک نقلی دلیل بھی کلام مجید سے پیش کی ہے اور وہ یہ کہ:-

"حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے" ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم"

(یعنی غیر مسلموں کے دیوتاؤں کو برا نہ کہو ورنہ ان کے ماننے والے خدا کو برا کہیں گے) - ہر چند دیوتاؤں کو برا کہنا نہ صرف مباح بلکہ ضروری ہے، لیکن محض اس مفسدہ سے بچنے کے لئے کہ خدا کو بھی گالیاں دیجائیں گی منع کر دیا گیا"

اس سے مولانا نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جب دیوتاؤں کو برا کہنا جو اتنا اچھا فعل ہے فساد کے اندیشہ کیلئے منع کیا گیا تو اندیشہ لہو و لعب سے تو مکبر الصوت کا استعمال بدرجۂ اولیٰ ناجایز ہونا چاہئے۔ میں نے مولانا کے جواب کی اصلی عبارت نقل نہیں کی ہے، لیکن اس کا مفہوم وہی ہے جو عرض کیا گیا۔ اب اس کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ کیا اس سے زیادہ ذہنی غلامی کی کوئی مثال اور مل سکتی ہے اور کیا اسی عقل و فراست کا نام شرع میں "تفقہ فی الدین" رکھا گیا ہے اور کیا ایسے علماء کی پیروی تہذیب و انسانیت کے لئے باعث ننگ نہیں؟

چونکہ مولانا نے اس مسئلہ میں عقل و نقل دونوں سے کام لیا ہے اس لئے آیئے ان دونوں کی حقیقت پر بھی غور کریں اور دیکھیں کہ ان سے اور کیا احکام و مسایل متفرع ہو سکتے ہیں

اگر مولانا کے جواب کا تجزیہ کیا جائے تو حسب ذیل نتائج اس سے اخذ ہوتے ہیں:-

۱- جمعہ و عیدین کے خطبہ کے لئے یہ ضروری نہیں کہ لوگ اسے سنیں بھی، صرف ان کا اس جگہ موجود رہنا کافی ہے

۲- آلۂ مکبر الصوت کا استعمال لہو ولعب ہے اور تشبہ ہے کفار کے ساتھ۔

۳- دوسرے مذاہب کے دیوتاؤں اور خداؤں کو برا کہنا نہ صرف مباح ہو بلکہ بعض حالات میں "مندوب" و مستحسن بھی ہے۔

سب سے پہلے شق اول کو لیجئے جس میں خطبہ کا سننا ضروری نہیں ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ از روئے فقہ جمعہ وعیدین کے خطبہ کا سننا ضروری نہیں ہے اور لوگوں کا اختتام خطبہ تک صرف وہاں موجود رہنا کافی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ ان مسایل فقہیہ میں سے نہیں ہے جو نصوص قطعیہ سے ثابت ہوئے ہوں، بلکہ صرف وقتی حالات کے تحت متفرع کئے جاتے ہیں اور وقت وزمانہ کے حالات کے لحاظ سے بدلے جا سکتے ہیں۔

اسلام کی روح جو اس کے تمام شعایر سے ظاہر ہوتی ہے صرف اجتماعیت ہے، پھر ظاہر ہے کہ بہترین اجتماعیت خیال وحرکت اور فکر وعمل دونوں کی اجتماعیت ہوا کرتی ہے اور اس کے بعد صرف عمل کی اجتماعیت، محض خیال کی اجتماعیت کوئی چیز نہیں کیونکہ اگر کسی جماعت کے افراد خیال کے لحاظ سے متحد ہوں اور عمل کے لحاظ سے متفرق ومنتشر تو یہ بالکل بے نتیجہ بات ہوگی، اسی لئے اسلام نے زیادہ تر عمل پر زور دیا ہے لیکن اس نے فکر وخیال کی اجتماعیت کو نظر انداز نہیں کیا کیونکہ اگر قول وفعل دونوں ہم آہنگ ہوں تو اجتماعیت میں بہت زیادہ رسوخ پیدا ہو جاتا ہے۔

اگر جمعہ وعیدین کے خطبہ کا سننا قرونِ اولیٰ میں ضروری نہیں سمجھا گیا بلکہ صرف وہاں کی حاضری کافی قرار دی گئی، تو اس کا سبب یہ نہ تھا کہ وہ نفس خطبہ کی اہمیت یا اس کے سننے کی افضلیت کے قایل نہ تھے بلکہ صرف اس بناء پر کہ اس کے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہ تھا جو ہزاروں لاکھوں آدمیوں تک اس آواز کو پہونچا سکتے اور اس لئے بدرجۂ اقل صرف وہاں بیٹھے رہنے ہی کو ضروری قرار دیا تاکہ اس طرح کم از کم اجتماع کی ظاہری کیفیت تو باقی رہیگی اور اس سے لوگوں پر اثر پڑے گا۔ اگر حکم یہ دیا جاتا کہ جو لوگ خطبہ سن سکتے ہیں وہ بیٹھے رہیں اور باقی چلے جائیں تو اجتماعیت میں انتشار پیدا ہو جاتا۔

اب نفس خطبہ کو لیجئے کہ بجائے خود وہ ضروری ہے یا نہیں۔ اس سے مولانا تھانوی کو بھی غالباً انکار نہ ہوگا کہ خطبہ سے مقصود عوام کو تعلیم دینا ہے ان کے اخلاق درست کرنا ہے اور اگر حال کی اصطلاح میں ظاہر کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اپنے مقاصد کا پروپاگنڈا کرنا ہے، پھر ظاہر ہے کہ ایک خطبہ کا اثر اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس کو سنا جائے، محض یہ منظر کہ مولانا اشرف علی صاحب دور ممبر پر کھڑے ہوئے اپنے چشم ولب یا ہاتھوں کو حرکت دے رہے ہیں اور ان کا کوئی لفظ ہمارے کانوں تک نہیں پہونچتا، نہ کوئی دلنشین منظر ہے نہ مفید۔ اس لئے خطبہ کی بہترین صورت یہی ہو سکتی ہے کہ تمام حاضرین اسے سن سکیں، اور اگر یہ کسی ذریعہ سے ممکن ہو تو اس کا اختیار کرنا نہ صرف اقتضائے عقل ومصلحت ہے بلکہ تعلیمات اسلامی کا اسلوب بھی یہی چاہتا ہے۔

اب دوسری شق کو لیجئے۔ مولانا کا یہ ارشاد بالکل درست ہے کہ کسی ایسی نئی چیز کا اختیار کرنا جو باعث فساد ہو یا

جس میں احتمال لہو ولعب ہو مناسب نہیں، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مکبر الصوت کونسا مفسدۂ لہو ولعب پیدا کرسکتا ہے اگر مولانا اس کا استعمال صرف اس لئے مناسب نہیں سمجھتے کہ غیر مسلم اس کا استعمال کرتے ہیں اور اس طرح تشبہ بالکفار ہوجائے گا، تو پھر اس دلیل کی بنا پر انھیں خود بھی بہت سی باتیں ترک کردینا چاہئے۔

مولانا ریل میں سفر کرتے ہیں، موٹر پر سوار ہوتے ہیں، بجلی کی روشنی میں نماز پڑھتے ہیں۔ ڈبل روٹی مکھن استعمال کرتے ہیں، کفار کی مشینوں کا بنا ہوا کپڑا پہنتے ہیں، خط وکتابت میں کارڈ ٹکٹ استعمال کرتے ہیں جن پر تصویر بنی ہوتی ہے، تار کے ذریعہ سے اپنے پروگرام کی اطلاع اپنے مریدوں کو دیتے ہیں، ولایتی بنی ہوئی گھڑیوں کی مدد سے افطار واسحار کے اوقات کی تعیین کرتے ہیں اور اسی طرح کی بہت سی وہ باتیں کرتے ہیں جن میں (انھیں کی دور از کار تاویل کی بنا پر) تشبہ بالکفار بھی پایا جاتا ہے، مفسدۂ لہو ولعب کا اندیشہ بھی، لیکن حیرت ہے کہ مولانا ان سب کو تو جایز سمجھتے ہیں اور مکبر الصوت کے استعمال کو ناجایز بتاتے ہیں — لہو ولعب یا کسی اور مفسدہ کا احتمال ہر ایسی سی اچھی بات میں پایا جاسکتا ہے اور اسکا تعلق ہر شخص کی انفرادی نیت سے ہے۔ نماز سے زیادہ مقدس عمل کوئی نہیں، لیکن وہ بھی لہو ولعب ہوسکتی ہے، اگر کوئی شخص اس کو کھیل سمجھ کر کرے، قرآن شریف کی تلاوت ترتیل کے ساتھ نہایت اچھا فعل ہے، لیکن اگر اس سے کوئی موسیقی کا لطف اٹھانے لگے تو وہ بھی لہو ولعب میں داخل ہوجائیگا۔ صدقہ وزکوٰۃ کے فضایل ظاہر ہیں، لیکن اگر اس سے مقصود بیجا نمود ونمایش ہو تو یہ بھی مفسدہ میں داخل ہوجاتا ہے، الغرض تشبہ بالکفار ایسی بات ہے جس سے مولانا خود بھی نہیں بچ سکے اور احتمالِ لہو ولعب ایسی وسیع چیز ہے کہ نماز روزہ بھی اس کے حدود میں آسکتا ہے چہ جائیکہ مکبر الصوت۔ اس لئے ایسے معاملات میں ہمیشہ افادی پہلو کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا چاہئے اور ایک نئی چیز کو اختیار کرنے سے اس لئے باز نہ رہنا چاہئے کہ وہ اس سے پہلے نہ پائی جاتی تھی، دیکھنا یہ چاہئے کہ وہ ہمارے لئے مفید ہے یا نہیں اور اس سے جایز فایدہ اٹھانے کی کیا صورت ہے — مولانا نے اپنے اسی فتویٰ میں جو دلیل نقلی پیش کی ہے وہ نہ صرف اس لحاظ سے کہ اسکا کوئی تعلق مسئلۂ زیر بحث سے نہیں ہے بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ مولانا نے اپنی طرف سے بھی اس کے مفہوم میں اضافہ فرمایا ہے، بالکل ساقط الاعتبار ہے — مولانا نے کلام مجید کی جو آیت پیش کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے مذاہب کے دیوتاؤں یا خداؤں کو برا کہنا اسلام نے منع کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اسکی وجہ بھی ظاہر کردی ہے کہ اس سے فساد کا اندیشہ ہے، لیکن مولانا نے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ باطل معبودوں کو گالیاں دینا نہ صرف مباح ہے بلکہ بعض صورتوں میں افضل بھی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ حضرت مولانا نے یہ استنباط کہاں سے کیا ہے اور اسکے اظہار کا کیا موقعہ تھا — میرے نزدیک تو پیش کردہ آیت سے قطعاً اسکی ممانعت کردی گئی ہے اور ایسی صورت میں اسکو مباح یا افضل بتانا سراسر نصِ قطعی کی مخالفت ہے، ہوسکتا ہے کہ کلام مجید کی بعض آیات سے وہ اسکا جواز بھی ثابت کرسکیں، لیکن یہ جواز بالکل اسی قسم کی تاویلات بارہ کا نتیجہ ہوگا جس قسم کی تاویلات سے مکبر الصوت کے استعمال کو ناجایز بتایا گیا ہے — یہ ہے ہمارے علماء کرام کی وہ قدامت پرستانہ ذہنیت اور کورانہ تقلید جس نے قوم کی قوم کو تباہ کرکے رکھدیا اور یہی ہیں وہ بت جن کو توڑنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

نظیر اکبر آبادی کی غزل گوئی

اور

ان کا غیر مطبوعہ کلام

نظیر اکبر آبادی ان شعرا میں سے ہیں، جن کی عظمت امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہے۔ نظیر اسوقت تک صرف نظم نگار کی حیثیت سے مشہور تھے اور ان کے رنگ تغزل سے لوگ ناواقف تھے

ہمارے عزیز دوست جناب لطیف اکبر آبادی نے اُن کی غیر مطبوعہ غزلوں کو سامنے رکھ کر جو اتفاق سے انکے ہاتھ آگئی ہیں یہ مقالہ سپرد قلم کیا ہے اور جس تفصیل کے ساتھ نظیر کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے وہ اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے

لطیف صاحب کے سامنے نظیر کے متعلق اور بھی بہت سے کام ہیں جن کو وہ فی الحال خاموشی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی صاحب نظیر کے متعلق کوئی معلومات رکھتے ہوں تو براہ کرم اُن سے آگرہ کے پتہ پر مراسلت کریں۔ (اڈیٹر)

تمہید

زندگی حرکت سے عبارت ہے، اُس کے کسی شعبے میں ٹھیراؤ آجانے کی مثال "بند پانی" کی سی ہے جس میں بُو بے فساد آجاتی ہے۔ شعر و ادب زندگی ہی کا ایک شعبہ ہے، اُس کا بھی کسی ایک نقطے پر قایم رہ سکنا محال ہے۔ شعر و ادب اگر ترقی نہیں کرتا تو یقیناً پست ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ مسئلۂ ارتقا کے مطابق اُردو زبان میں ایسے اربابِ کمال پیدا ہوتے رہے جنھوں نے اُردو ادبیات کو صناعت کے درجے تک پہونچایا، مگر انھیں اربابِ کمال میں وہ جوہر قابل بھی رونما ہونے لازمی تھے جو دوسروں کی طرح اپنے حال اور ماحول کا آلۂ کار نہ تھے، بلکہ اُن لوگوں میں سے تھے جو عمومیت اور تقلید سے بغاوت کر کے اپنی راہ الگ بناتے، اور اس طرح مستقبل کی زبان بن جاتے ہیں۔ چونکہ ایسے لوگ اپنے عہد سے مختلف ہوتے ہیں، اس لئے اُن کے معاصر اور معاشر اُنھیں سمجھ نہیں سکتے اور وہ مردود کر دئے جاتے ہیں۔ لیکن جلد یا بدیر

وہ وقت آجاتا ہے جب اُن کے جوہر اور قابلیت کی قدر کی جاتی، اور اُن کی پرسش ہونے لگتی ہے۔ یہی زمانہ اُن افراد کا حقیقی عہد ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جونسن نے ایسے ہی نفوس کے متعلق کہا ہے:-

"ہر وہ شخص جسے لکھنا پڑھنا آتا ہے، قلم اُٹھا سکتا ہے اور اُٹھاتا ہے۔ لیکن ایسے لوگوں کی کثرت، زبان کو اُسی صورت وحالت میں استعمال کرتی ہے، جس صورت وحالت میں کہ زبان اُنکے سامنے آتی ہے، یا جس صورت وحالت میں کہ وہ زبان کو پاتے ہیں لیکن اس کے برخلاف ایک فطین شخص زبان کو اپنے مقصود اور غایت کا ماتحت بنالیتا اور اپنی خصوصیت کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے اُسکے دماغ میں عندیات (Ideas) کا جو ہجوم اور تواتر ہوتا ہے، اُس کے اندر جو احساس وخیال، تخیل و آرزو، ہمرنگی و تضاد، رونما ہوتے رہتے ہیں، امتیازات وتصورات جو اُس کے لئے فطری ہیں، زندگی و آداب زندگی کے متعلق اُسکی رائے، تواریخ کے باب میں اُس کا فیصلہ، اُس کی جدت وظرافت (لغوی معنے میں) کی مشق اور اُسکی قابلیت وفرزانگی کا عمق، یہ تمام ناقابل شمار مخلوق اور خود اُس کے ذہن کی تیک، اُس کے دماغ میں مشتکل ہوجاتی ہیں اور وہ ان سب کو مناسب الفاظ اور موافق زبان میں، اپنے مخصوص انداز بیان میں، پیش کرتا ہے۔ اُس کی یہ زبان اظہار اُس کے ذہنی بطون سے مشابہ اور اُسی طرح کی کثیر الاشکال ہوتی ہے، وہ ایسی زبان اختیار کرتا ہے جو اُسکی شخصیت کے زور کا قرار واقعی اظہار اور اُس کا عکس وپرتو ہوتی ہے"

عہد متاخرین تک اُردو ادبیات کی تاریخ میں صرف دو ہستیاں ایسی نظر آتی ہیں جن پر جونسن کی یہ تعریف صادق آسکتی ہے یعنی نظیر اور غالب، ان دونوں نے عام مسلک کو ترک کرکے اپنے لئے نئی راہ پیدا کی اور دونوں ہمیشہ مطعون رہے۔ اُن کے زمانہ میں اُن کی قدر ہونا ناممکن تھا، اگر ہوتی بھی تو بالکل غلط بنیاد پر۔ لیکن اُن کا اصلی عہد بھی آگیا۔

باوجود تاخر، غالب کی قدر نظیر سے پہلے پہچانی گئی۔ یعنی غالب پچاس ساٹھ سال اور نظیر سو سال زمانہ مابعد کی زبان تھے۔ اس تقدم وتاخر کی وجہ شاید یہ ہو کہ جدید تعلیم نے فلسفیانہ خیالات کی قدر کرنا ہمیں پہلے سکھایا اور صحیفۂ فطرت کے مطالعہ کا درس بعد میں دیا۔

اگست ۱۹۳۸ء میں "یوم نظیر" کی تقریب پر، دلی ریڈیو اسٹیشن سے میں نے ایک مختصر گفتگو میں میاں نظیر کی غزلگوئی پر روشنی ڈالی تھی، اس موقع پر اُسی موضوع کے متعلق تفصیلی اظہار خیال مقصود ہے۔ نظیر اسوقت تک جس بنا پر مشہور ومعروف ہیں وہ اُنکی نظمیں ہیں، اور اُنکے متعلق مخالف یا موافق آراء کا مدار اُنکا وہی کلام رہا ہے جو مشاہدۂ فطرت یا مناظر قدرت کی شاعری سے موسوم ہے۔ نظیر کا غزلیہ کلام نشر واشاعت نہیں پاسکا۔ اس کی ایک توجیہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ اُن کی غزلگوئی اُن کی نظموں کی شہرت سے دب گئی اور دوسری یہ کہ اُن کا غزلیہ کلام عدم اشاعت کے باعث منظر عام پر نہ آسکا، اس لئے کہ اُن کے متداول کلیات میں پچیس کے قریب غزلیں شامل تھیں اور پروفیسر شہباز کو بھی، جنھوں نے واقعتاً نظیر کو دوسرا جنم دیا، تقریباً سو غزلیں دستیاب ہوسکیں۔ لیکن سید عابد علی صاحب اکبر آبادی نے گزشتہ دس سال کی مسلسل جستجو کے بعد کچھ غیر مطبوعہ نظموں کے علاوہ غزلیہ کلام کا جو ذخیرہ فراہم کرلیا ہے، آج اُس کی تعداد چھ سو غزلوں سے اوپر ہے۔ سید صاحب نے حقیقتاً اُردو زبان اور نظیر کے مداحین پر زبردست احسان کیا ہے، لیکن قوم کی پست ہمتی کو دیکھتے ہوئے کیا امید ہوسکتی ہے کہ یہ مجموعہ یا اُس کا ایک عمدہ انتخاب ہی

طبع و اشاعت پاسکے گا؟ اس مضمون کی ترتیب کے وقت میرے سامنے نظیر کا ایک قلمی نسخہ ہے جس میں تقریباً دو سو غزلیں اور اسّی نظمیں شامل ہیں۔ نظموں میں اکثر مطبوعہ اور غزلوں میں بیشتر غیر مطبوعہ ہیں۔

اوائل عمر میں نظیر نے نادر گردی کا زمانہ دیکھا تھا اور زندگی کے تقریباً سو سال پورے کرنے میں ہندوستان کے قصر شہنشاہی کے بام و در گرنے کا نظارہ کیا تھا۔ امرا و شرفا کی خانہ ویرانی بھی دیکھی اور غاصبوں اور غداروں کا عروج پانا بھی۔ زندگی کے نشیب و فراز کے ان مناظر کا سامنے آنا اور زمانے کی اس سفلہ پروری سے دوچار ہونا، ہر صحیح الفکر انسان کو غور و تامل پر مجبور کر دیتا ہے نظیر کی حکیمانہ نظر نے عالم کی بے ثباتی اور زندگی کی حقیقت کو بے نقاب دیکھا۔ معلمی کے پیشے نے طبیعت میں قناعت اور استغنا پیدا کر دیا۔ شاہی درباروں کا طمع اور امیرانہ جاہ و حشمت کی قلعی اگر نظیر کے سامنے اس طرح نہ کھلتی تو شاید لکھنؤ حیدرآباد اور بھرتپور کے بلاوے مسترد نہ ہوتے۔ غرض نظیر حصول مال کی طرف سے بے پروا اور تحسین و آفرین سے بے نیاز تھے دولت سے نفرت، فلسفیانہ طبیعت کا اور شان و مرتبت سے بے پروائی، شاعرانہ بصیرت کا نتیجہ ہے۔ نظیر نے کسی کی حاشیہ نشینی قبول نہ کی، کیونکہ وہ خود طبیعت کے بادشاہ تھے۔ جب طبیعت اور مزاج کا یہ عالم ہو تو ایک شخص کا خوش خلق اور منکسر المزاج ہونا بھی فطری سی بات ہے۔ چنانچہ ان حالات و اسباب کا اقتضا یہی ہو سکتا تھا کہ میاں نظیر کی صحبت میں عام طبقے کے لوگ زیادہ نظر آئیں۔ ماحول کا اثر مسلم ہے۔ نظیر کے شعری اکساؤ نے وہی موضوع منتخب کئے جو عام دلچسپی اور لگاؤ کی چیز تھے اور وہی انداز اختیار کیا جو عام فہم ہو سکتا تھا۔

نظیر کا انتخاب موضوعات ایک خاص نکتہ ہے جس کو سمجھ کر ہم ایک طرف تو ان کی تحریک شعری کی صداقت کو سمجھ سکتے ہیں اور دوسری طرف خود اُنکے نفس و مزاج کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اُن کے موضوعات شعر کی نوعیت پر غور کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ نظیر گو طبقۂ متوسط سے متعلق تھے جو سماجی قوانین کی جکڑ بندیوں میں زیادہ اُلجھا ہوتا ہے، لیکن اپنے رجحان شعری کے مقابلہ میں وہ اپنے سماج سے ایک ذرہ بھر مرعوب نہ تھے۔ اُن کی شاعری اُن کی طبیعت کا تقاضا تھا جس میں اُن کی فطرت جھلکتی تھی۔ شاعری ان کے لئے وجہ تفاخر یا ذریعۂ معاش نہ تھی۔

ایک حقیقی شاعر کی داخلی زندگی اُس کے شعر میں پوری طرح منعکس ہوتی ہے، لیکن کسی شاعر کے کلام سے اُسکی خارجی زندگی مرتب کرنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ رہن سہن کا طریقہ یقیناً اتنا دلچسپ نہیں ہو سکتا جتنا رہن سہن کی آرزو اور احساس دلچسپ ہو سکتے ہیں، کیونکہ وہ اصل شاعر ہوتا ہے۔ ایک شاعر کا اپنا کردار جس قدر اُس کے جذبات میں جھلک سکتا ہے اُتنا افعال میں نمایاں نہیں ہوتا کیونکہ اکثر جذبات فعل کی صورت اختیار کرنے سے رہ جاتے ہیں۔ لیکن ایک سچا شاعر فکراً و حساً اور عملاً و فعلاً مختلف نہیں ہوتا۔ چنانچہ نظیر کی داخلی و خارجی زندگی، یعنی اُنکے جذبات و حسیات اور فعل و عمل میں شدید قسم کی مطابقت پائی جاتی ہے۔ اور چونکہ میاں نظیر زندگی کے نقاش ہیں اور زندگی بھی سامنے کی، یہی سبب ہے کہ اُن کے یہاں مقامی رنگ اس کثرت اور اس خصوصیت کے ساتھ نظر آتا ہے۔

نظیر کی مبتذل گوئی

میاں نظیر کی شاعری کے متعلق اظہار خیالات سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ اُن کی ابتذال نویسی کی حقیقت پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ جہاں تک نفسِ اعتراض کا تعلق ہے، میری نظر سے اور بہت سے شعرائے فارسی و اُردو کا ایسا ہی کلام گزرا ہے، پھر تعجب ہے کہ صرف نظیر ہی ہدف ملامت بنانے کے لئے کیوں چھانٹا گیا؟ میں جس نتیجہ تک پہونچ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ ابتذال کا لفظ بہت ہی محدود معنے میں نظیر کے کلام کی نسبت استعمال کیا جا سکتا ہے۔ نظیر نے تقلید ترک کر کے تصنع سے بغاوت کی فطانت نے اُن کو حقیقی شاعری کا مسلک سمجھایا اور اُنھوں نے سامنے کے مظاہر زندگی کو اس طرح بیان کیا کہ عوام میں مقبول ہو گئے۔ چونکہ اُنھیں عوام سے سند قبول ملی، اس لئے لوگوں نے آنکھ بند کر کے اُن کے کلام کے پوچ اور مبتذل ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا۔ یہ اُن کے عہد کے سماج کا قانون تھا کہ اجلاف جس بات کو پسند کرتے، اشراف میں معیوب سمجھی جاتی تھی۔

ممتاز اور قابل ذکر افراد میں سب سے پہلے نواب شیفتہ نے یہ اعتراض وارد کیا تھا۔ پھر مؤلف آبِ حیات نے نظیر کے استخفاف پر کمر باندھی اور اُن کے بعد مولانا شبلی نے شیفتہ کی رائے اور آزاد کے خیال کی تائید کی۔ آجکل کے بعض نوجوان "ادیب" بھی اسی رائے اور خیال سے متاثر ہو کر نظیر کو فحش گو اور مبتذل نویس کہتے ہیں۔

مجھے شیفتہ کی رائے سے کوئی تکرار اور حجت نہیں۔ اول تو وہ ذاتی رائے تھی، کہیں سے مستعار نہ تھی اور رائے آزاد ہے۔ دوسرے یہ کہ شیفتہ جس سماج کے فرد تھے اُس کے بازار میں امارت کی ٹکسال میں ڈھلی ہوئی اشرافت کا سکہ چلتا تھا، اس لئے اُس عہد کا ادب بھی اُسی طبقے کے مزاج و مذاق کا آئینہ تھا۔ ادنےٰ طبقے "اجلاف" کے نام سے موسوم تھے جن کی زندگی زندگی نہ تھی کہ ادب میں جگہ پائے، یا جس کا ذکر ادب کہلائے۔ یہ بات چونکہ متانت یعنی امارت یا شرافت سے خارج تھی، اس لئے ادب سے بھی خارج تھی، اور حقیقت تو یہ ہے کہ اُس عہد میں زندگی و ادب کے مابین تعلق کا خیال ہی کب پیدا ہوا تھا! لہٰذا شیفتہ کی رائے اُسوقت کے معاشرتی رجحان اور ادبی میلان کی پوری طرح آئینہ داری کرتی اور اُسے کامل صداقت کے ساتھ پیش کر دیتی ہے۔ اُس زمانہ کا معیار شعر و شرافت نظیر کی شاعری پر بھی تنقید کر سکتا تھا

شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد کا خیال قابلِ افسوس ہے۔ وہ نئے رجحانات ادب کے مبلغ تھے۔ حیف ہے کہ اُنکے مذاق فطرت پرستی کو نظیر کے تمام سرمایۂ شاعری میں چند ہی شعر ایسے نظر آئے جو میر کے کلام سے ٹکر کھاتے تھے!

لیکن یہ ماجرا بہت زیادہ افسوس ناک ہے کہ مولانا شبلی نعمانی کی بالغ نظر بھی نظیر کی شاعری میں کوئی حسن و خوبی نہ دیکھ سکی اور وہ شیفتہ اور آزاد کے ہمنوا ہو گئے۔ حالانکہ مولانا کا زمانہ شیفتہ کے زمانہ سے مختلف تھا۔ جدید خیالات کافی طور پر پھیل چکے تھے۔ ادب اور صناعت کے نظریوں کی کافی اشاعت ہو چکی اور اُن میں وسعت آ چکی تھی۔ شیفتہ کے عہد کی تنگ نظری باقی نہ تھی۔ مولانا خود جدید علوم پر نظر رکھتے تھے

میرا قیاس یہ ہے کہ مولانا نے نظیر کے کلام پر نظر ڈالے بغیر اپنے پیشروؤں پر اعتماد کیا۔ لیکن اس طرز عمل سے اُن پر

ایک غیر ذمہ دارانہ اظہار رائے کا الزام عاید ہوتا ہے اور شبلی سے عالم و فاضل کے لئے یہ ایک کمزوری ہے۔ بایں ہمہ شاید اس کی کوئی تاویل ہو سکتی ہے، مگر اس کا کیا جواب ہے کہ اپنے قیام حیدر آباد میں مولانا نے پروفیسر شہباز سے یہ سن کر کہ وہ نظیر پر کچھ کام کر رہے ہیں، اُن کی اس سعی و کاوش کو فعل عبث سمجھا اور اگرچہ پروفیسر صاحب کی توجیہ کرنے پر مولانا نے اُنسے اتفاق رائے کر لیا، لیکن نظیر کے متعلق مولانا کی اصلی رائے "موازنۂ انیس و دبیر" میں موجود ہے اور اُس میں کسی ترمیم کا علم کم از کم مجھے نہیں ہو سکا ہے۔

گریجویٹ اُدبائے جدید کے اعتراض کی حقیقت بس اتنی ہے کہ پچھلے زمانوں کے مقابلہ میں آج کل انسانی مصروفیتیں چونکہ بہت زیادہ ہیں، نیز یہ عہد مشینی کہلاتا ہے، اس لئے کفایت وقت کی خاطر ہم اپنی بہت سی ضرورتیں "طیار" چیزیں خرید کر پوری کرنے میں سہولت دیکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ سیاسیات قسم کے شعبوں میں اخبارات اور لیڈروں کی رائیں اپنا لینا شاید مصالحے کی بات نہ ہو، مگر زندگی کے ہر شعبے میں اس سہولت پر عمل کرنا بہت پر خطر ثابت ہو سکتا ہے

شعر کی بحث میں اگر لفظ ابتذال کا مفہوم کچھ وسیع اور نوعیت کچھ مختلف ہو جاتی ہے۔ معنوی ابتذال سے شاید ہی کسی شاعر کا دامن پاک رہا ہو، لیکن لسانی (لفظی) ابتذال بھی نہایت ثقہ شاعروں کے کلام میں موجود ہے۔ سعدی کی گلستاں کا باب پنجم خاص و عام کی زبان پر ہے۔ امیر خسرو کی مثنوی "عشقیہ" میں زفاف کی تفصیل، حکیم سنائی کی مذمتوں میں خواہر و دختر کی مذمت، اور صدہا شعرا کی ہجو و ہزل ہمارے سامنے ہے۔ چونکہ اکثر اور ثقات شعرا کے یہاں بھی ایسا ادب پایا جاتا ہے، اس لئے ہم یہی ایک نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ "واقعیت نگاری" سے قطع نظر، اس قسم کا کلام اظہار قدرت و کمال کے تحت عالم وجود میں آتا تھا اور جب یہ حال ہے تو تنہا نظیر کو مطعون کرنا کہاں کا انصاف ہو سکتا ہے؟

نظیر کے کثیر ذخیرۂ شاعری میں چند نظمیں یا اشعار ایسے ہیں جن پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے۔ لیکن اُن چند نظموں میں بھی دو چار ہی ایسی ہیں، جو کسی ادبی قدر کے بغیر پست ہیں، ورنہ باقی نظموں میں کوئی نہ کوئی ادبی قدر اور صناعتی قیمت پائی جاتی ہے۔ لیکن نظیر کے کلام پر نظر ڈالتے وقت ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ وہ مطالعۂ حیات کرنے والا شاعر ہے، اور یہ بھی فراموش نہ ہونا چاہئے کہ زبان کے مرتبہ کا موضوع کے رتبہ سے بلند و پست ہونا اُصول فن کے خلاف ہے۔ پھر یہ بھی سامنے رکھنا ہے کہ آج کا نظریۂ صناعت موضوع کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کو مہمل سی بات سمجھتا ہے۔ اس باب میں صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا گیا ہے یا نہیں۔ آج شاعر کا مسلم منصب یہ ہے کہ جو موضوع اُس کی توجہ کو جذب کر سکے اور ایک شاعر میں وسعت نظر و خیال لازمی ہے۔ وہ کامل صداقت اور انتہائی صفائی سے اُس کا اظہار کر دے ایک شاعر اگر کسی مبتذل موضوع کا اظہار پوری صداقت اور کامل حسن سے کر دیتا ہے تو اُسے صناعت ہی کہا جائے گا نظیر کی مبتذل گوئی کے ذیل میں ایک اہم اور واقعاتی نکتہ یہ ہے کہ اُن کے کلام کا ایک معقول جز و فرمایشی اور بدیہی ہے۔ منجملہ اور روایتوں کے آگرہ میں یہ بھی مشہور ہے کہ لوگ راہ چلتے میاں نظیر کے ٹٹو کی باگ پکڑ لیتے اور حسب حال شعروں

کی فرمائش کرتے تھے اور چونکہ وہ ہر شخص کے لئے قابل حصول اور فقیرانہ مشرب کے آدمی تھے اور انھیں کسی کی دلشکنی گوارا نہ تھی، فوراً کچھ شعر کہکر لوگوں کو ہنسا دیتے اور خوش کر دیتے تھے۔ دوسرے یہ کہ میاں نظیر کی حُسن پرستی خود اُن کے کلام سے ثابت ہے۔ حُسن کی محفلوں میں جانے کا پروانہ میاں نظیر کے پاس بدیہہ گوئی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟ چنانچہ اُن کی بعض نظموں سے صاف اور بین طور سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرمائشی ہیں اور فی البدیہہ کہی گئی ہیں۔ ایسا کلام لہجہ کے اعتبار سے بھی پست ہے اور اُس میں معائب شعری بھی موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ عوام کی یا بازار حسن کی فرمائشیں پوری کرنے میں، نظیر نقائص شعری دور کرنے کے لئے جان نہ کھپاتے ہوں گے اور ہنسنے ہنسانے کے لئے لہجے میں عمداً عامیانہ انداز رکھتے ہوں گے۔ چنانچہ اُن کے ایسے کلام کو اُس کلام سے جو شاعرانہ تأثر کے تحت وجود میں آیا ہے، بآسانی تمیز کیا جا سکتا ہے۔ بایں ہمہ اُن کی زیست نگاری کی خصوصیت دونوں طرح کی شاعری میں نمایاں رہتی ہے۔

نظیر کے معترض اگر مجموعۂ کلام کو غور سے دیکھتے تو زبان کا اختلاف معیار دیکھ کر اُن کو خود بخود نظر آجاتا کہ "کنہیا جی کا بالپن" اور "شیخ سلیم چشتی"، "آدمی نامہ" اور "بھنگ کا پیالہ"، "خربوزے" اور "عشق کی ہمہ گیری" کی زبان اور لہجے میں بہت بڑا فرق و امتیاز ہے۔ اگر ایسا کیا جاتا تو نہ صرف یہ کہ وہ اپنے اعتراض کا جواب پا لیتے بلکہ اُن پر نظیر کا کمال فن بھی آشکارا ہو جاتا

نظیر کی شاعری کسی شاعر کے کلام پر تبصرہ کرتے وقت ہمارے یہاں بالعموم مضمون آفرینی، بندش کی چستی، تشبیہ کا حُسن استعارے کی خوبی، اور محاورے کی برجستگی وغیرہ دکھانے میں توجہ صرف کی جاتی ہے۔ میں اس روایتی طریقے کو ترک کر کے نظیر کی بعض ایسی خصوصیات کو اُجاگر کرنے کی کوشش کروں گا جو سرسری مطالعہ میں نظر سے رہ جاتی یا عام نگاہوں میں نہیں آتی ہیں۔ مجھے یہاں یہ بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ میرا مقصود کلام نظیر کی تحسین ہے لیکن "تحسین" کا مفہوم "تقریظ" نہ سمجھنا چاہئے۔

فنی اعتبار سے نظیر کی شاعری میں فروگزاشتیں ہیں، لیکن بڑے بڑے مسلم الثبوت شعرا کے یہاں بھی ایسی فروگزاشتیں موجود ہیں۔ شکسپیر کے اغلاط اگر جایز قرار دے جا کر اُن کی ایک جدالغت تیار ہو سکتی ہے، وہٹ مین (Whitman) اگر "قانون بالذات" کا لقب پا سکتا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ نظیر بھی مستثنیٰ نہ کئے جائیں۔ شعر کے بہت سے محاسن کو اس بناء پر مسترد کر دینا کہ اُس میں بعض شرطیں پوری نہیں ہوئی ہیں ایک غیر فلسفیانہ حرکت بھی ہے۔ نظیر کی فنی غلطیوں پر دوسرے مستند شعرا کی مثالیں دے کر پروفیسر شہباز نے ایک جامع بحث کی ہے اور ضروری نہیں کہ یہاں اس موضوع پر اس سے زیادہ بحث کی جائے۔

شیلے (Shelley) نے شعر کی ایک نہایت جامع تعریف کی ہے، وہ کہتا ہے کہ "شعر زندگی کا ہو بہو نقش ہے، اور شعر میں زندگی کی خارجی صداقت کا اظہار ہوتا ہے" بالفاظ دیگر شاعر اپنی صناعت میں فطرت انسان کی شکلیں بناتا ہے جو اُن افعال کے فنا ہو چکنے کے بعد بھی جن کی کہ وہ نقل ہیں، بصورت اعجاز باقی رہتی ہیں۔

نظیر فطری و حقیقی شاعر ہیں اور اُن کا تقلید سے بغاوت کر کے زبان سے اپنی غایت کے مطابق کام لینا اُنکو جدید حسن کے مطابق، ایک فطین شاعر ثابت کرتا ہے اور اس لیے کہ نظیر کی نظر وسیع ہے اور پوری زندگی اُن کے سامنے ہے، انسانی خوبیاں اور خرابیاں یکساں طور پر اُن کی شاعری کا مسالا ہیں اور وہ زندگی کے سچے نقشے کھینچتے ہیں، شیلے کی تعریف اُنھیں حقیقی شاعر بتاتی ہے۔

عام طور پر نظیر کی شاعری ایک چشمے کی مثال ہے۔ اُن کے شعر کی روانی چشمے کی سی روانی ہے اور جس طرح ایک چشمہ کا پانی کہیں گہرا کہیں اُتھلا ہوتا ہے، اور جہاں اُتھلا ہوتا ہے، وہاں تہ کے بلور پارے اور کہیں کہیں جواہر ریزے اپنی رنگینی و دل کشی نمایاں کرتے دکھائی دیتے ہیں، مگر چشمہ کا راگ ہے کہ برابر جاری ہے، بالکل یہی کیفیت نظیر کے کلام کی ہے

نظیر کے پاس شعر کے مسالے کی بہتات ہے۔ اُن کو اپنی شاعری کے موضوع اور مسالے سے کتنا گہرا تعلق اور انہماک ہے؟ وہ اُس سے کس قدر لطف و لذت حاصل کرتے ہیں؟ اس کا اندازہ کرسکنا دشوار ہے۔ ہم اُن کے کلام سے محسوس کرتے ہیں کہ میاں نظیر بسنت کے موسوم میں در و دیوار، زمین و آسمان کو بسنتی دیکھ رہے ہیں، ہولی کے دنوں میں اُنکو عبیر، گلال اور زعفران کی بارش ہوتی دکھائی دیتی ہے، بھنگ اور شراب کے نشے میں چور چلے آرہے ہیں، بچوں کے ساتھ کھیلنے میں دنیا و مافیہا کو بھولے ہوئے ہیں، عورتوں کے لباس کی خوشرنگی اور زیور کی زیبائی اُنھیں مسرت کی بہشت میں پہونچائے دے رہی ہے، غرض تیج تہوار، میلے ٹھیلے، رسوم و تقریبات، اُن کے احساس کی نقاشی کے لئے آب و رنگ ہیں، اور اُن کے احساسات و اشارات کا یقینی ذریعہ بن جاتے ہیں۔ چونکہ اُن کے شعر کا مسالا زندگی فراہم کرتی ہے اسلئے اُن کے اظہار میں زندگی کی صداقت جھلکتی ہے۔ مسالہ کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ ایک چیز کی تمام قسمیں گنوا، اور اُس کے متعلق اتنی تفصیل پیش کر دیتے ہیں کہ بعض وقت یہی بات اُن کی تعبیر و بیان کو وہ بلندی نہیں ملنے دیتی جو ایجاز کلام سے حاصل ہوا کرتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ جن واقعات و اشیاء کا بیان کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اُن واقعات و اشیاء کی حسی و جسمانی زندگی میں ڈوب جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ اُن کے انداز اظہار کو بھی اپنا لیتے ہیں اور یہی احساس کی معراج ہے نظیر جس طرح احساس کرتے ہیں اُسی طرح اظہار کر سکتے ہیں اور اس اظہار سے سننے یا پڑھنے والے میں بھی وہ احساس اُسی طرح پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ شاعر کے احساس میں مساویانہ شریک ہو جاتا ہے

فطرت پرستی نظیر کی فطرت ہے کسی وقت بھی وہ فطرت کا ساتھ چھوڑتے معلوم نہیں ہوتے۔ وہ جب کسی پرند کی چہکار سنتے ہیں، جب ستاروں کی جگمگاہٹ نظر آتی ہے، جب چاندنی چھٹکی ہوئی دیکھتے ہیں، جب دھنک نکلی ہوئی دکھائی دیتی ہے، تو وہ فطرت سے اُتنے ہی قریب ہوتے ہیں جتنا ابوالبشر اُسوقت ہوئے ہوں گے جب اشیاء و انواع نے اسماء کا جامہ نہیں پہنا تھا نظیر ہمیں اپنے سروش غیبی سے ہمکلام ہوتے سنائی دیتے ہیں وہ ہمیں یہ معلوم کرا دیتے ہیں کہ اُن کا ماحول اُن کے لئے ایک جذبہ کی صورت رکھتا ہے، وہ اُسے ایک طلسم زار کی صورت میں دیکھتے اور اُسے

ایک طلسم زار ہی کی طرح محسوس کر کے لطف اندوز ہوتے ہیں

جان ڈرنک واٹر (John Drink Water) کے بقول شاعری دو غالب اثرات سے متاثر ہوتی ہے۔ ایک خود شاعر کی شخصیت سے اور دوسرے اُس زمانہ کی اسپرٹ سے نظیر کی شاعری میں اُن کی شخصیت کے زور کا قرار واقعی اظہار تو ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے، لیکن اُس عہد کی اسپرٹ کے عوض عہد مستقبل کی اسپرٹ زیادہ دیکھنے میں آتی ہے۔ نظیر کی فطانت کی یہی سب سے بڑی دلیل ہو سکتی ہے اکیونکہ یہ بھی ایک مسلم بات ہے کہ ہر شاعر کے ذہن میں ایک نمونہ و مثال ضرور ہوتی ہے جس کے سانچے میں اُس کی شاعری ڈھلتی ہے۔ لیکن نظیر کے سامنے ایسا کوئی نمونہ نہ تھا۔ وہ مشاہدۂ فطرت تک صرف اپنی فطانت کے زور سے پہونچے، جذبات کو انقلابی شکل میں پیش کرنا اور عام زندگی کے تمام پہلوؤں سے اپنے شعر کا مسالہ حاصل کرنا اُنھیں فطانت ہی نے سکھایا۔ اس اعتبار سے نظیر کو غالب پر بھی فوقیت ہے۔

شعر نظیر کی نمایاں صفت بندش کی سادگی اور بیان و خیال کی روانی ہے۔ جو میر کی سادگی و روانی سے مختلف ہو بلاشبہ میر کا احساس مقابلتاً گہرا ہے، لیکن حسنِ تخلیق اور جمالِ کائنات کے اظہار میں اُردو کا کوئی شاعر نظیر کے مقابلہ میں نہیں لایا جا سکتا اس سے انکار نہیں کہ نظیر کے یہاں میر کی طرح نفسیات کے گہرے رازوں کا انکشاف نہونے کے برابر ہے لیکن نفسیات کا دائرہ جذبات محبت ہی میں محدود نہیں ہے۔ نظیر کے یہاں نفسیات کا انکشاف ہے اور مبادیِ نفسیات تو اُن سے کسی موقعے پر ترک نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ وہ عام انسانوں کے شاعر ہیں۔ یہ بھی تسلیم نہیں کہ نظیر نے غالب کی طرح فلسفہ کی گتھیاں نہیں سلجھائیں، لیکن نظیر فلسفۂ زندگی کے جسے انگریزی میں (Everyday Philosophy) کہا جاتا ہے، مفسر ہیں اور وہ اُن کے یہاں موجود ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ وہی وہ ہے۔ کیونکہ اُن کے پیش نظر سامنے کی زندگی ہے۔

نظیر کی نقاشیِ فطرت کے ضمن میں شعرائے مرثیہ گو خاص کر میر انیس کا ذکر کیا جا سکتا ہے لیکن غور کرنے کے بعد واضح ہو جائے گا کہ نظیر اور انیس میں بہت بڑا فرق ہے، دونوں کا نقطۂ نظر ایک نہیں ہے۔ مرثیہ میں جو قدرتی مناظر ہمارے سامنے آتے ہیں وہ شاعر کے عشقِ فطرت اور اُس کے مشاہدے کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ بلکہ اُن کے لئے "روایتی بیانات" کا نام زیادہ موزوں ہے۔

نظیر کی شاعری کے متعلق ڈاکٹر فیلن نے مبسوط اظہار خیال کیا، اور اُس کو سچی شاعری اور نظیر کو اعلیٰ پائے کا شاعر تسلیم کیا ہے۔ نظیر کی شاعری کے متعلق ایک خاص بات یہ اور کہنا ہے کہ کسی خاص یا نئے انداز کی شاعری کے پھلنے پھولنے کے لئے خاص ہی فضاء و ماحول کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ آزادی سے سانس لے سکے۔ مگر نظیر کے انداز شاعری کے لئے اُن کا زمانہ ناموافق تھا، اس لئے اُن کا مسلک شعر پھیل نہ سکا، اُس کا وقت اب آیا ہے۔ عصری رجحانات غمازی کر رہے ہیں کہ ادبی مستقبل نظیر ہی کے ہاتھ ہے۔ عہد حاضر واقعیت نگاری پر فریفتہ ہے، اور نظیر اُس سے بھی

بڑھکر فطرتیت (Naturalism) پر کاربند ہیں۔ نواب جعفر علی خاں اثر نے فطرتیت کے اعتبار سے نظیر کو اولیت کا مرتبہ دیا ہے۔

الغرض نظیر کا غزلیہ کلام دیکھ کر ایک سخن سنج اس قطعی نتیجہ پر پہونچے گا کہ وہ غزل گوئی میں اپنے معاصر اساتذہ کے ہم پایہ اور فطرت یا زندگی کی نقاشی میں بالکل منفرد اور یگانہ تھے۔ نظیر کی غزل کا پیرایہ تو وہی ہے جو مروج تھا لیکن خیال و بیان کا انوکھا پن غزل میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔

نظیر کا تغزل

نظیر کے کلام میں تغزل کا رنگ، ضروری نہ تھا کہ علٰحدہ عنوان سے دکھایا جاتا، کیونکہ دوسرے عنوانوں کے تحت جو مثالیں آئیں گی اُن میں دیگر شعری خوبیوں کے علاوہ نظیر کے تغزل کا رنگ بھی نظر آجائے گا۔ تاہم یہ ظاہر کرنے میں کوئی ہرج نہیں کہ نظیر کے یہاں کافی تغزل ہے۔ وہ کہیں کہیں معشوقانہ انداز بھی اختیار کر لیتے اور مناسب حد تک شوخ و ظریف بھی ہو جاتے ہیں۔ اکثر غزلیں معاملے کی باتوں میں قطعہ بند ہو گئی ہیں یا مسلسل کہنی پڑی ہیں۔ اس جگہ چند شعر اور ایک پوری غزل اس خیال سے نقل کی جاتی ہے :-

آیا جو مرے قتل کو کھینچے ہوئے شمشیر، کیا آن تھی اللہ اسوقت کوئی لفظ مرے منہ سے نہ نکلا بجز حرف اہا ہا

آغوشِ تصور میں جب ہم نے اُسے مسکا — لبہائے نزاکت سے ایک شور تھا بس بس کا

سو بار حریر اُس کا مسکا نگہ گل سے — شبنم سے کب اے بلبل پیراہن گل مسکا

اُس وقت جیسی نکلیں مری حسرتیں نظیر — اُن لذتوں کو دل ہی سمجھتا ہے یا خدا

لڑھی، منہ سے نہ بولی، روٹھ بیٹھی، جھڑکیاں دے لیں — اُسے سب کچھ بن آتا ہے تجھے کچھ بن نہیں آتا

ساقی بہار آئی اور جوش ہے گلوں کا — لا جام بھر کے اسن لیں، ٹک شور بلبلوں کا

بہر نظر دیکھ لیں اُس عہد شکن کی صورت — دیکھئے کون سا یارب وہ زمانہ ہو گا

ساقی بھی یوں جام لیکر رہ گیا — جس طرح تصویر ہو ساغر بکف

قرار لینے کو جاتے ہیں ہم جب اُسکے پاس — زیادہ اور بھی ہو بے قرار آتے ہیں

ہر زخم پر ہے آہ کے بدلے صدائے واہ — کیا پر دلی ہے اس دل خانہ خراب میں

شوقِ دیدار ہے یا جذبۂ اُلفت ہے، غرض — کوئی تو ہے کہ جو کھینچے لئے جاتا ہے مجھے

مجھ پر ابرو کی یوں نہ کھینچ کماں — او، میں تیری کمان کے قرباں

داد تیرے بھی حسن کی دیتا — آج ہوتا اگر نہ کنعاں

ٹھنڈی آہیں جگر سے نکلیں ہیں، — اشک بھی متصل ہیں قطرہ زناں،

دم غنیمت ہے پھر کہاں اے دل — یہ ہوا سرد اور یہ آب رواں،

بوسہ لیجئے جو ہو کے دست و کمر — اتنی ہم میں کہاں ہے تاب و تواں
وہ دہن اور کہاں لب اپنے نظیر — وہ کمر اور کہاں یہ ہاتھ میاں

نظیر کی زبان و فرہنگ یہ بالکل صحیح ہے کہ شاعری کی زبان روزمرہ کی کاروباری زبان نہیں ہو سکتی، لیکن یہ بھی اُسی قدر مسلم ہے کہ حقیقی شاعر روزمرہ کی زبان سے ہٹ کر بہت دور بھی نہیں جا سکتا غالباً یہ ارسطو کا قایم کردہ اُصول ہے کہ زبان کا معیار موضوع کے رتبہ کے متعلق ہونا چاہئے۔ نظیر کی شاعری میں جو زبان استعمال ہوئی ہے اُس کے معیار کا تنوع ایک ناطق استدلال ہے کہ یہ مختلف معیار سوچ سمجھکر اختیار کئے گئے ہیں نظیر نہ صرف اُردو زبان پر عبور رکھتے تھے۔ عربی، فارسی، اُردو، بھاشا، پنجابی، پوربی اور مارواڑی زبانوں کے شعر اُن کی ایک غزل میں موجود ہیں، جس کا مقطع ہے:-

کبھی تو ہنس کر شتاب آجا نظیر کی طرف بھی ٹک اے جاں
بنا کے سیج دھج، پھرا کے دامن، لگا کے ٹھوکر، ہلا کے بالا

عام طور پر نظیر نے صادہ و صاف زبان میں شاعری کی ہے اور چونکہ نظیر کے خیال میں اُلجھن نہیں ہوتی اسلئے زبان میں بھی گنجلک نہیں آنے پاتی ہے۔ مخمور صاحب نے اپنی تالیف "روح نظیر" میں توجہ دلائی ہے کہ نظیر الفاظ کا استعمال اُسی طرح کرتے تھے جس طرح وہ الفاظ عام بول چال میں آتے تھے۔ یہ صحیح ہے، مگر اُسی حد تک جہاں تک کہ موضوع کا تعلق ہے۔ نظیر کے یہاں موضوع کی مناسبت و اختلاف سے بزار اور بازار، دوانہ اور دیوانہ وغیرہ کا استعمال ہوا ہے۔

الحاصل نظیر "جو بولو وہ لکھو" کے اُصول پر عامل تھے۔ رسالہ مخزن کی ترقی کے زمانہ میں یہ آواز کان میں پڑجاتی تھی۔ لیکن الہلال اور پھر نگار نے اس گفتگو کو سوال کی حد سے ہی باہر نکال دیا تھا۔ اس زمانہ میں آکر اجتماعیت اور اشتراکیت کے خیالات نے پھر وہی آواز کانوں میں پہونچائی ہے، اور اُس سے زیادہ قوی استدلال کے ساتھ یعنی ادب کو قومی زندگی کا آئینہ ہونا چاہئے، اس لئے زبان کا معیار وہ ہو جسے زیادہ سے زیادہ باشندگان ملک سمجھ سکیں!

اِس اُصول و استدلال کے خلاف یہ کہا جائے گا کہ ادب عوام کے لئے نہیں ہوتا۔ ادب ثقافت (کلچر) کا نتیجہ ہے اور عوام میں ثقافت نہ ہونے ہی کے باعث وہ عوام کہلاتے ہیں۔ اس لئے ادب کو اگر عام فہم بنا دیا گیا تو وہ ادب نہیں رہے گا اور چاہے جو کچھ ہو جائے۔

لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ ادب قومی عادات و خصایل کا آئینہ ہوتا ہے، تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ثقیف اقلیت پر قوم کا اطلاق نہیں ہو سکتا اور جو ادب اکثریت کی زندگی کو منعکس نہ کرے وہ صحیح معنے میں ادب کہلانے کا مستحق

نہیں۔ کم از کم اُسے قومی ادب نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ہمارے ادب میں قومی زندگی کا عکس نہیں ہے، تو یقیناً ہمیں چاہئے کہ اپنے ادب کی پیشانی سے یہ داغ دھونے کے لئے اُسے قومی زندگی سے قریب تر کر دیں اور اگر ایسا کرنے میں نفاست یا ادبیت کا کچھ نقصان ہو بھی تو اُس کا خیال نہ ہونا چاہئے۔ اسلئے کہ ثقافت اور ادب یعنی زبان، ذی حیات عضو کہے جاتے ہیں۔ زبان کا معیار بدل دینے کے بعد بھی اُس میں نفاست و ادبیت پھر آ سکتی ہے اور اس اضافے کے ساتھ کہ اُس کے اندر قوم کی زندگی بڑی حد تک رونما ہو گی اور قوم کا بڑا حصہ اُس سے فیض یاب ہو سکے گا، یعنی ثقافت حاصل کر سکے گا۔

اِس بحث کو ذرا پھیلا دینے سے میرا مقصود یہ بتانا تھا کہ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے نظیر نے آگرہ میں بیٹھ کر ادب اور زبان کا یہی معیار قایم کیا تھا، درانحالیکہ حاتم کے وقت سے اُن الفاظ کو کاٹنے چھانٹنے کا عمل جاری تھا، جو عوام کی زبان پر چڑھ جاتے تھے۔ نظیر نے وہ زبان پھیلانا چاہی اور وہ ادب پیدا کیا جس کو ہماری اکثریت سمجھ سکتی اور جس میں ہماری اکثریت کی زندگی منعکس تھی۔ لہٰذا اس اعتبار سے کہ اُنھوں نے ایک قومی زبان اور قومی ادب پیدا کیا، ہمارے تمام شاعروں میں ایک نظیر ہی قومی شاعر کہلانے کے مستحق ہیں۔

جیسا میں نے ابھی عرض کیا، ہماری زبان میں ترک اور تراش کا عمل بہت جلد شروع ہو گیا تھا اور متقدمین کی اس تراش خراش کے عمل نے زبان کا دائرہ ہمیشہ تنگ رکھا اور بہت سے مفید و کار آمد الفاظ کو ساقط الاعتبار کر دیا ——— اس سے انکار نہیں ہو سکتا اس طرز عمل سے اُردو نے شستگی و نفاست اور قابلیت اظہار کا بلند مرتبہ بہت تھوڑی ہی مدت میں حاصل کر لیا، لیکن توسیع زبان کا مسئلہ اپنی جگہ اٹل رہا اور ہے۔ متروکات میں اکثر ایسے سبک الفاظ پائے جاتے ہیں جن کے معنے وسیع اور مفہوم نازک ہیں اور جن کی ہمیں آج ضرورت ہے مگر وہ مسکے اب رائج نہیں

اس دور کے بعض شاعروں اور ادیبوں نے اس بات کا احساس کیا ہے کہ پرانے الفاظ زندہ اور نئے الفاظ اور اسلوب وضع کئے جائیں۔ وہ اس طرف بھی مائل ہیں کہ زبان و عروض کی نارواگرفتیں کچھ ڈھیلی کر دی جائیں

نظیر نے اپنے زمانہ میں صرف کاٹ چھانٹ سے اعراض ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وسیع پیمانے پر اختراع و تصرف پر بھی بڑی دلیری سے عامل رہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو نظیر کی خدمت زبان اندازے سے باہر نظر آتی ہے۔ نظیر کا ذخیرۂ الفاظ تمام اُردو اہل قلم سے زیادہ ہے اور میرا عقیدہ ہے کہ جب بھی ہم خلوص مقصد اور سنجیدگی مدعا سے توسیع زبان کے مسئلہ پر غور کرنے بیٹھے تو اسالیب و الفاظ کا بڑا ذخیرہ حاصل کرنے میں کلام نظیر سے ہم کو بہت زیادہ مدد ملے گی

اگر موجودہ معیار پر جانچا جائے تو نظیر کے یہاں زبان کی غلطیاں ہیں وہ فارسی اور ہندی کے الفاظ عطف و اضافت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں جیسے "جواں ولڑکے" یا "گھنگرو تال" وغیرہ، اوپر کہا جا چکا ہے کہ وہ عام تلفظ کا اتباع کرتے ہیں جیسے عجوبہ یا سر آنا (بجائے سرہانا) یعنی حروف گرا دیتے ہیں۔ وہ ضرورت پر جمع الجمع بھی بنا لیتے ہیں جیسے "عنایاتیں"

وہ قدیم الفاظ بھی استعمال کر لیتے ہیں جیسے ستی بمعنی سے، "سوتیاں" بمعنی سوتی ہیں، اور "ملونا" بمعنی ملانا۔

لیکن فارسی ہندی الفاظ کی ترکیب اُسوقت کے بعد تک کے شعراء کے یہاں پائی جاتی ہے اور پرانے الفاظ کا استعمال بھی بالکل متروک نہ ہوا تھا۔ حروف گرا دینے کے باب میں میری اوپر کی توجیہ شاید زبردستی کی تاویل نہ سمجھی جائے گی۔ یعنی نظیر کے اُس کلام میں جو فرمائشی اور فی البدیہہ ہے اور جو محض تفریح و تفنن طبع کے طور پر وجود میں آیا ہے یقیناً عروض کی پروا نہیں کی گئی ہے اور نہ صحت لفظی کا خیال رکھا گیا ہے۔ یہ فروگزاشت اور ناہمواری اسی قسم کے کلام میں زیادہ نظر آتی ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ چند مثالیں جو پیش کی گئی ہیں میرے نسخے میں اسی قدر مل سکیں اور اس لئے وہ قابل لحاظ بھی نہیں ہو سکتیں۔ بایں ہمہ، اعجوبہ سے الف گرا کر عجوبہ لکھنا میرے خیال میں اچھی جدت ہے اور اگر غور و فکر کے ساتھ ایسی کارآمد اور مناسب بدعتوں کو روا رکھا جائے تو شاید زبان کی وسعت و اصلاح کے لحاظ سے بھی مفید ہو۔

اس بحث میں اختراع و اشتقاق نظیر کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت ہے۔ میاں نظیر لفظ گھڑنے میں کسی وقت تامل نہیں کرتے۔ خاص کر قافیے کے باب میں اُن کو مطلق پروا نہیں ہوتی کہ اُن کا سکہ ٹکسال باہر سمجھا جائے گا یا نہیں۔ بلکہ اُن کے تیور سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یا تو وہ کسی احتساب کا وجود ہی تسلیم نہیں کرتے یا اپنے تئیں اُس سے بالا، یا اپنے آپ کو ہر اجتہاد کا مجاز سمجھتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے زبان کو وسیع کرنے کا خیال پس پشت بھی ڈال دیا جائے، تب بھی شاید اس سے انکار نہ کیا جا سکے کہ اُس طرز عمل کا یہ فایدہ (سہولت) کیا کم ہے کہ شاعر کو خیال کا خون نہیں کرنا پڑتا چنانچہ اس پہلو سے نظیر قافیہ کے بادشاہ ہیں۔ اُن کے بعد یہ مرتبہ انشاء کو حاصل تھا، یا پھر اس عہد میں اکبر الہ آبادی نے یہ خصوصیت پیدا کی تھی۔

زبان کو احساس یا خیال کے اظہار کا واسطہ ہونے کی حیثیت حاصل ہے اور زبان کا ایسا صحیح استعمال جو اظہار خیال بخوبی کر سکے اپنی جگہ خود ایک صناعت ہے اور ایک مخصوص نوعیت کی صناعت۔ ہر فن و صناعت کے کچھ ضابطے اور قاعدے ہوتے ہیں اور اگر اُن کی پیروی کامل طور سے کر لی جائے تو نتیجہ مطلوب مکمل ہوتا ہے۔ لیکن زبان کے استعمال کا ایسا کوئی ضابطہ و نظام نہیں۔ استعمال الفاظ کا فن دیگر فنون کی طرح اکتسابی نہیں اور استعمال الفاظ کی یہی خصوصیت ہے جس نے "اہل زبان" اور "زباندان" کی اصطلاحیں وضع کرا دیں۔ زبان کا صحیح استعمال مطالعہ، غور، اور مشق و ممارست پر منحصر ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک فطری ملکہ ہے۔ اظہار کی سلامت بعض کو بعض کے مقابلہ میں زیادہ حاصل ہوتی ہے اور خوش بیانی و خوش کلامی ایک خداداد بات ہے۔ پھر یہ کہ زباندان ہو یا اہل زبان اور مطالعہ، غور اور مشق کتنی بھی بڑھی ہوئی کیوں نہ ہو، یہ حد درجہ مشکل بات ہے کہ کوئی شخص ہمیشہ اور ہر وقت تمام سلسلۂ خیالات کو صحیح اور قطعی الفاظ میں ادا کر سکے، یا مختلف اور نازک احساس کو اُسی رنگ میں اور اُسی نزاکت کے ساتھ ہمیشہ بیان کر سکے۔

دوسرے یہ کہ زبان کا استعمال صناعت کا درجہ حاصل کر لینے کے بعد، زبان اظہار خیال کا واسطہ ہی نہیں ہوتی، بلکہ وہ پر پرواز بن جاتی ہے جس سے وہ خیال اڑنے لگتا ہے۔ نفسیات کے ماہر ہی بتا سکتے ہیں کہ انسانی فکر و خیال کے ارتقا و ظہور میں، اُن کو ذہنوں کے اندر مرتسم کر دینے میں اور اُن کو زمانۂ مستقبل کے مطالعہ و غور کے لئے محفوظ کر دینے میں، زبان کو کتنا زبردست دخل ہے۔ صحیح و درست الفاظ کا استعمال سامع یا مخاطب کی قوت مدرکہ کو کس طرح بیدار، اُس کے ذہن و فہم کو کتنا طیار، اور اُس کے قلب کو کس درجہ آمادہ کر دیتا ہے!

زبان پر عبور رکھنے اور الفاظ کا صحیح استعمال کرنے کے پہلو سے دیکھا جائے تو نظیر ادبائے اُردو کی صف میں بہت آگے نظر آتے ہیں۔ نواب جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی نے ڈانٹے اور نظیر کے ایک ہی نوع کے خیال کا مقابلہ کر کے بتایا ہے کہ محض استعمال الفاظ پر قدرت کی وجہ سے نظیر، ڈانٹے کے مقابلہ میں کیونکر سبقت لے گئے اور اُنکی تخئیل کس درجہ مکمل ہو کر سامنے آئی ہے۔

اسی بحث میں، میں ایک خاص مسئلے کی طرف بھی توجہ دلا دینا چاہتا ہوں۔ لکھنؤ کی زبان کا اتباع کرنے والے یوں تو ہندوستان کے ہر حصہ میں ملیں گے، لیکن بعض الفاظ و محاورات ایسے ہیں جو لکھنؤ سے باہر مشکل سے سُنے جائیں گے۔ اس سے غالباً انکار نہ کیا جائے گا کہ "فسانۂ عجائب" کی تصنیف سے قبل لکھنوی زبان ایک معیار کی حیثیت نہیں رکھتی تھی، یا کم از کم ایسی کوئی معیاری کتاب موجود نہ تھی۔ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ سرور اکبر آباد کے رہنے والے تھے اور چالیس سال کی عمر میں وطن چھوڑا تھا۔ چنانچہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ زبان آگرے سے لکھنؤ پہونچی۔ میاں نظیر کے یہاں وہ مخصوص الفاظ ملتے ہیں جو سرور کے یہاں ہیں اور آج بھی لکھنوی زبان کی خصوصیت بنے ہوئے ہیں۔ یہ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں، تلاش سے زیادہ مل سکیں گی:۔

لفظ "اُپی" کا استعمال "دیا سرمہ آنکھ میں وہ بلا، جیسے اُپی تیغ پہ باڑھ دھری"۔ یا اہلے گہلے کا استعمال "طریق جیسے ہے عشرت کے اہلے گہلوں کا"۔ یا زری کا استعمال:۔ "ہاتھ بڑھا کر جو لی میں نے زری پنکھیا"۔ یا شور بور کا استعمال:۔ "شور بور سارا کپڑے تھے لال میرے"۔ یا پہنانا جیسے:۔ "مجھ زلف کے مارے کو نہ زنجیر پہناؤ"۔ یا پہ بمعنی پر کا استعمال جو پہلے مصرع میں بھی موجود ہے، وغیرہ۔

نظیر کی لسانی و ادبی خصوصیات کے ذیل میں جو مثالیں پیش کی جائیں گی، وہ ہر چند کہ خاص عنوانات کے تحت ہوں گی لیکن اُن کی وجہ سے دیگر خصوصیات شعری اور محاسن ادبی بھی سامنے آجائیں گے جن پر علیحدہ توجہ دلانا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

نظیر کی اختراعی مثالوں سے اُن کا کلام بھرا پڑا ہے، لیکن اُن کا وہ خمسہ جس کا عنوان "پری کا سراپا" ہے خاص چیز ہے۔ اُس کی چند ٹیپیں پیش ہیں، اسمار کی صفتیں کس قدر صحیح، مناسب و مخصوص اور کتنی شاعرانہ ہیں،

بیان و زبان کی نزاکتوں کو سمجھنے والے لطف اندوز ہوں گے :-

چتون کی دغا، نظروں کی کپٹ، سینوں کی لڑاوٹ ویسی ہے
گالوں کی دمک، خوبی کی جھمک، رنگوں کی کھلاوٹ ویسی ہے
بندوں کی ہلت، جھمکوں کی جھکت، بالی کی ہلاوٹ ویسی ہے
کفشوں کی کھٹک، دامن کی جھٹک، ٹھوکر کی لگاوٹ ویسی ہے
ٹھٹوں کی اُڑاوٹ اور غضب، قہقہ کی ہنساوٹ ویسی ہے

غزل کے دو شعر اسی رنگ کے ملاحظہ ہوں :-

کدھر ہے آج الٰہی وہ شوخ چلبلیا — کہ جس کے غم سے مرا دل ہوا ہے بے کلیا
سو یار آپ نہ آیا رقیب کو بھیجا، — ہزار حیف ہم ایسے نصیب کے بلیا،

ظاہر ہے کہ نظیر نے ہندی الفاظ جو اُس وقت تک زبان میں کثرت سے شامل تھے، بلا تکلف استعمال کئے ہیں جیسے جوگی بمعنی افراد۔ ہندی تصریف سے بہت کام لیا ہے جیسے راجہ سے رجوا وغیرہ اور ہندی ڈھنگ پر مرکب لفظ بنائے ہیں جیسے مہ رتن وغیرہ۔

نظیر نے الفاظ اور محاورات کے نادر و نفیس محل استعمال کئے ہیں اور اُن کو اپنی خصوصیت و ذہانت کے سانچے میں ڈھال کر مرضی کے مطابق کام لیا ہے :-

شرارت، شوخی، عیاری، طرح، پھرتی، دغا، چھلبل (اس مصرع میں طرح کا استعمال نادر ہے۔)
دل عبرتوں سے چھا گیا، خاطر ہوئی بس سہم گیں — بولی نظیر عبرت سے رہ، کیا پوچھنے کی ہے جگہ

(ان مصرعوں میں عبرت چھانا اور عبرت سے رہنا مخصوص استعمال ہے)

کرتا ہے گلبازی کی یاں ایکدم میں گردوں گل جھڑی (گل جھڑی بمعنی خزاں یا نامساعدت اچھوتا بیان اور مخصوص ترکیب ہے)

جلی جہاں میں کسی کی نہ زیر بریانی (زیر بریانی بمعنی تہ دیگ نظیر کی ایجاد ہے)
کہ جس سبب سے تو پھرتا ہے اس قدر شیدا (شیدا پھرنا اچھوتا محاورہ ہے)
اُس حسن کا پڑا ہے کانوں میں جب سے جھنکا (حسن کا جھنکا یعنی شہرہ یا چرچا)
ہم سمجھ جاتے ہیں پیارے تری خاطر کی مروڑ (خاطر کی مروڑ عمدہ محاورہ ہے)
پہن کے رنجنی پوشاک چھب دکھاتی ہے ("رنجنی" پوشاک کی ایک نادر صفت ہے)
نیند اُچٹ گئی، کروٹ جل گئی، کاٹے نہیں کٹتی ہے رات (کروٹ جلنا کتنا پیارا محاورہ ہے)

کاجل ڈھلکا، سرمہ بگڑا، منھ میں پان ہوا پھیکا (تینوں محاورے نہایت پاکیزہ ہیں)
اُس کا نخرا یہ غضب دل کے تئیں چھل گیا (سرایۂ بیان اور محاورہ خاص چیز ہے)
کیا تجھ سے نظیر اب میں جوانی کی کہوں بات اس پن میں گزرتی ہے عجب عیش سے اوقات
(پن کا یہ استعمال بالکل نیا ہے)

تو نے چھوئی کیوں مری زیب بھری پنکھیا (زیب بھری خاص ترکیب ہے)
یا — پوتڑوں میں لیٹے سو سو مزے بلسنا، (بلسنا To enjoy کے لئے ہمارے یہاں کوئی مفرد مترادف موجود نہیں ہے)

جو مجھ پہ آن پڑا دن سیاہ مت پوچھو (دن سیاہ کی ترکیب ندرت لئے ہے)

فارسی ترکیبوں کے استعمال میں بھی نظیر نے جدتوں سے کام لیا ہے :—

سہی قامت، پری پیکر، مقطع وضع، خوش منظر (مقطع وضع، کم از کم آج نیا معلوم ہوتا ہے)
کل جو گزرے تھے ہم کہنہ مزار ستان میں ("ستان" کا استعمال آجکل کچھ نیا سمجھا جا رہا ہے)

پھر ان میں زیب فزا کہکشاں نگاری کی
وہ تو وہ پر اس کی ذاتی کو دیکھا چاہئے
کیا پُر دلی ہے اِس دل خانہ خراب میں
چوم لوں میں ابھی اُس شوخ پری وا کے لب
اُس رشک گلستاں کی ایک زیب شعاری نے

فارسی ترکیبیں نظیر کم استعمال کرتے ہیں، لیکن جہاں ہیں نہایت سبک و دل نشیں ہیں :—

ہو نمایاں جس طرح ابر تنک میں آفتاب
یا رِ مہ چہرہ اور شب مہتاب
شمیم زلف مشک افشاں، تغافل سوستم ساماں
غرور اور ناز بے پایاں، مزاج اور طبع نازک تر
ادائیں سب فسوں آئیں، نہ چھوڑیں دل نہ چھوڑیں دیں
فریب و عشوہ صلح آگیں، عتاب و غمزہ جنگ آور
ناز و ادا کی گرمیاں، غارت گر صبر و تواں
طور تکلم دُر فشاں، طرز تبسم شکریں

گوشِ گفتار طلب، دیدۂ دیدار طلب
زلفیں الم شام تھیں، رخ رشکِ سحر تھے

محاکاتِ شعری کی چند نازک مثالیں :-

ساقی نے سب کو جام دئے بھر کے بزم میں
ساغر جو ہم نے مانگا تو شیشہ ہلا دیا

کیا غضب تھی وہ ادا، آہ کہ چنچل نے شتاب
گونج کھلتے ہی جھجک کے جو سنبھالا بالا

جب ہلاتی ہے صراحی سی وہ گردن اپنی
نشۂ حسن کو کرتا ہے دوبالا بالا،

غرفے سے ہاتھ کھول کے اُس نے جو لیا کھینچ
بجلی سی کچھ چمک گئی، کافر بلا حنا

یہ برق ابر میں دیکھے سے یاد آتی ہے
جھلک کسی کے دوپٹے میں نورتن کی سی

اِس نقاشی میں نظیر نے ایک ایک لفظ سے تصویر بنائی ہے۔ انکار میں خالی شیشہ ہلا دینا ایک پورا مرقع سامنے پیش کر دیتا ہے۔ گونج کے کھل جانے سے جھجکنا عجیب منظر دکھا دیتا ہے۔ بالے کا ہلنا ایک تصویر بنا دیتا ہے حنائی ہاتھ کا دریچے کے اندر کھنچ جانا ایک نقش کھینچ دیتا ہے۔ ابر میں بجلی کی چمک کو دوپٹے کے نورتن سے تشبیہ دینا ایک نظارہ پیش کر دیتا ہے۔

اسم صفت وغیرہ کا نادر اور درست استعمال نظیر کی خصوصیت ہے، اور ہر چیز کے لئے اُن کے یہاں نام بھی الگ ملتا ہے۔

۱ — ساق بلور، گلاوٹ میں ہر ایک ران پری
۲ — یہ گلبدن، یہ شوخ، زنگیلی، ہری بھری
۳ — کیا پوچھے ہے اے رنگ بھری ہو مست مہینہ پھاگن کا
۴ — قمری کی سن نفیر، نہ بلبل کی سن صفیر،
۵ — مور کا شور، فغاں غوک کی، جھینگر کی جھنکار

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، نظیر پر اعتراض وارد کرنے میں بڑی سہولت اس سے ہو گئی کہ اُن کا غزلیہ کلام لوگوں کے سامنے نہ تھا۔ نظیر کی متانتِ کلام، علوئے بیان، اور ہمواریِ زبان کی مثال پیش کرنے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند پوری پوری غزلیں نقل کر دی جائیں، تاکہ کلام کے دوسرے پہلوؤں کا بھی بخوبی اندازہ ہو سکے :-

اُس کے شرارِ حسن نے شعلہ جو ایک دکھا دیا
طور کو سر سے پاؤں تک پھونک دیا، جلا دیا

پھر کے نگاہ چار سو ٹھیری اُسی کے روبرو
اُس نے تو میری چشم کو قبلہ نما بنا دیا

میں ہوں پتنگ کاغذی، ڈور ہے اُس کے ہاتھ میں
چاہا اِدھر گھٹا لیا، چاہا اُدھر بڑھا دیا

میرا اور اُس کا اختلاط، کیا ہو، مثال ابر و برق
اُس نے مجھے رُلا دیا، میں نے اُسے ہنسا دیا

تیشے کی کیا مجال تھی، یہ جو تراشے بے ستوں
شکوہ ہمارا ہے بجا، منت گروں سے، کس لئے
سن کے ہمارا عرض حال، یار نے یک بیک نظیر

تھا وہ تمام دل کا زور، جس نے پہاڑ ڈھا دیا
ہم نے تو اپنا دل دیا، ہم کو کسی نے کیا دیا،
ہنس کے کہا کہ بس جی بس، تم نے تو سر پھرا دیا

کچھ اُسے شرم، کچھ ہے ہم کو حجاب
کیوں نہ عشرت دو چند ہو جو ملے
زور کیفیتیں دکھاتے ہیں،
کرتے ہیں تار تار جیب الم
وقت خلوت یہ ہم نے اُس سے کہا (ق)
بولی ہم تو ابھی اُٹھا دیں مگر
اور جب آجائے غش تمھیں تو نظیر

ہے نئی چاہ میں یہ طرفہ عذاب
یار مہ چہرہ اور شب مہتاب
ساقیِ گلعذار و بادۂ ناب
تار قانون و بین و چنگ و رباب
اب تو ٹک منھ سے دور کیجئے نقاب
لائے کب آپ دیکھنے کی تاب
پھر چھڑکنا پڑے گا ہم کو گلاب

بحر ہستی میں، صحبتِ احباب
جس کو رقص و سرود کہتے ہیں
حسن اور عشق جس کو کہتے ہیں
فرصتِ عمر، قطرۂ شبنم
سب کتابوں کے کھل گئے معنی

یوں ہے، جیسے بروئے آب حباب
وہ بھی ہے ایک ہوائے خانہ خراب
خطۂ برق و قطرۂ سیماب
وصلِ محبوب گوہرِ نایاب
جب سے دیکھی نظیر دل کی کتاب

مقطع کی معنوی خوبی تحسین سے بے نیاز ہے۔ کھل گئے معنی کا مفہوم شرح ہو جانا بھی ہو سکتا ہے اور بے حقیقتی کا آشکارا ہو جانا بھی۔ بالفاظ دیگر دل کی کتاب دیکھے بغیر کسی کتاب کا مفہوم واضح نہیں ہوتا، یا دیکھنے کے لایق ہے تو دل ہی کی کتاب ہے۔

میں ہوں اور مہر وہ ہے اور ساقی ہو اور بزم شراب
پر خدا جانے یہ بیداری ہے اے دل یا کہ خواب

جوشِ عشرت، دورِ ساغر، رقصِ خوباں، صحنِ باغ
قصرِ رنگیں، فرشِ زریں، وقتِ خلوت، جائے عیش
بوسہ بازی، ہمکناری، بے حجابی، سرخوشی،
گل فشانی، شادمانی، کامرانی، خرمی

دل کشائی، بادہ نوشی، ذوق مستی، بے خودی

اس طرح کی عشرتوں میں اب تو بیٹھا ہے نظیر — پر خدا جانے یہ بیداری ہے اے دل یا کہ خواب

نہ دن کو چین، نہ راتوں کو خواب آنکھوں میں — بھرا رہے ہے ترے غم سے آب آنکھوں میں
جدھر وہ دیکھے اُدھر صف کی صف اُلٹ دے ہے — بھری ہے شوخ کے ایسی شراب آنکھوں میں
تمھارے ہم تو قدیمی غلام بندے ہیں، — تمھیں نہ چاہئے ہم سے حجاب آنکھوں میں
تھما نہ اشک، نہ نیند آئی، نا پلک جھپکی، — بسا ہے جب سے وہ خانہ خراب آنکھوں میں
خدا کی بات، جنھیں بات بھی نہ آتی تھی — وہ اب کریں ہیں سوال و جواب آنکھوں میں
قسم ہے چشم گلابی کی تیری اے گل رو — کہ یاں کھنچے ہے پڑانت گلاب آنکھوں میں
شتابی آن کے صحبو بگڑیاں رنگ لو — نظیر لایا ہے بھر کر شہاب آنکھوں میں

آنکھوں میں شہاب بھر کر لانے اور دنیا کے حسینوں کو صلائے عام دینے کی کیفیت کا بیان تقاضائے ذوق کرتا ہے

جس وقت خواب ناز سے وہ چشم وا ہوئی — صد خستۂ نخفتہ کی حاجت روا ہوئی
لا بوئے گل نہ کلبۂ احزاں میں اے نسیم — یہ کب ہماری روح کی راحت فزا ہوئی
یوں کاروان شباب کا گزرا کہ گوش زد — آواز پا ہوئی، نہ صدائے درا ہوئی
پوچھی نظیر ایک نے کل شکل وصل یار — ہم نے کہا یہ اُس سے کہ کیا کہئے کیا ہوئی
جو شکل دور باش تھی روز نخست کی — اب بھی جو ہم گئے تو وہی برملا ہوئی

آخری شعر جس پائے کا ہے اہل ذوق سے مخفی نہیں، لیکن میرا تاثر ہے کہ صرف ایک یہی شعر نظیر کو بے نظیر شاعر کہلوانے کے لئے کافی تھا۔

جوانی کا ماتم کس شاعر نے نہیں کیا، اور کون متنفس اس کا احساس نہیں کرتا، لیکن اس قطعہ میں نظیر نے جس داگداز مگر فلسفیانہ رنگ کا نوحہ کہا ہے اپنی جگہ بے نظیر ہے۔

اک دن دل اپنا عیش گذشتہ کو یاد کر — رہ رہ کے ہم سے مانگتا اُس کا
یعنی وہ کیا زمانۂ عشرت تھا اے نظیر — جس میں ہزار عیش سے میں کامیاب تھا
اب زار و ناتوان و ضعیف و نحیف ہوں، — نقش طلسم تھا وہ کوئی یا حباب تھا
اک جنبش مژہ میں وہ برہم ہوا طلسم — کیا کہئے اس کو اور مگر یہ کہ خواب تھا
جب ہم نے دل سے بھر کے دم سرد یوں کہا — جس میں مئے طرب سے تو مست و خراب تھا
ہیہات کیا بتائیں ہم اُس حصر خوش کا نام — اے غفلت انتما وہی عہد شباب تھا

تھی باغ زندگی کی اُسی سے ہی آب و رنگ — دیوان عمر کا بھی وہی انتخاب تھا
اپنی تو فہم میں وہی ہنگام دل فروز — مجموعۂ حیات کا لب لباب تھا

ترتیب الفاظ کی موسیقی

نظیر کا سارا کلام الفاظ کی موافقت و مناسبت یعنی خوش صوتی و ترنم سے مالا مال ہے۔ وہ بالعموم بجتی ہوئی بحریں اختیار کرتے اور الفاظ کو اس ڈھنگ سے ترتیب دیتے ہیں کہ جلترنگ کا نقشہ کھنچ کر رہ جاتا ہے۔ الفاظ کو موضوع سے کچھ ایسی ہم آہنگی ہوتی ہے کہ مضمون کانوں سے نظر آنے لگتا ہے۔ صرف ایک غزل ہولی کے بیان میں پیش کی جاتی ہے، ورنہ نظیر کی یہ خصوصیت عام ہے:-

ہولی کی رنگ فشانی سے ہے رنگ یہ کچھ پیراہن کا — جوں رنگا رنگ بہاروں میں ہو حال چمن اور گلشن کا
جس خوبی اور رنگینی سے گلزار کھلے ہیں عالم میں — ہر آں چھڑکواں جوڑوں سے ہے حسن کچھ ایسا ہی تن کا
لے جام لبالب بھر دینا پھر ساقی کو کچھ دھیان نہیں — یہ ساغر پہونچے دوست تلک یا ہاتھ لگے دشمن کا
ہر محفل میں رقاصوں کا کیا سحر دلوں پر کرتا ہے — وہ حسن جتانا گانے کا اور جوش دکھانا جوبن کا
اُس گلرو نے یوں ہم سے کہا کیا مستی و مدہوشی ہے — نا دھیان ہمیں کچھ چولی کا نا ہوش تمہیں کچھ دامن کا
جب ہم نے نظیر اُس گلرو سے یہ بات کہی تو کہنے لگا — کیا پوچھے ہے اے رنگ بھری ہے مست جبینا یہ گن کا

اِن اشعار کی وجدانی کیفیت اپنی جگہ، لیکن تیسرے کا معنوی کنایہ اور واقعیتِ حیات کا اشارہ وجد آفریں ہے۔

نظیر کا معشوق

اُردو فارسی کی شاعری کی روایات قدیمہ کے خلاف نظیر نے اپنا محبوب عورت کو بنایا، اور بے تکلف تانیث کی ضمیر استعمال کی ہے۔ میں نے اس خاص نظر سے اُن کی دو سو غزلیں پڑھیں تو مشکل سے تین چار شعر ایسے ملے جن کا مخاطب امرد ہو سکتا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اُس عیب کی جو نظیر کے یہاں خصوصیت سے مفقود ہے، جناب مخمور کو شاعرانہ تاویل و اعتذار کی ضرورت محسوس ہوئی، اُن کی نظموں میں دو ایک جگہ اگر اس نوع کا بیان پایا جاتا ہے تو وہ حیات نگاری اور زندگی کی نقاشی کے ذیل میں ہے۔ ایسے بیانات کو نظیر کی ذات خاص سے متعلق کر دینا نقد و درایت صحیح کے منافی ہوگا۔ ہم ایک شاعر کے کلام سے اُس کی پسند و ناپسند، رغبت و نفرت کا اندازہ تو کر سکتے ہیں، مگر اُس کے ہر اظہار خیال کو اُس کا اصل کردار قرار نہیں دے سکتے۔ شاعر تو دوسروں کے تجربات و افتاد، احساس و جذبات کو بھی احساس کے ذریعہ سے اپنا بنا لیتا ہے۔ اس ذکر میں شاید یہ بتانا نتیجہ خیز ہو کہ نظیر کے یہاں ساقی کی شخصیت محبوب سے الگ بھی ہے، ہر چند کہ اُن کا معشوق بھی یہ رسم ادا کرتا ہے:-

ساقی کو جام دینے میں اُس خوش نگہ کی، آہ — ہر دم اشارتیں ہیں کہ "اُس کے تئیں نہیں"

نظیر کا مطمح محبت

فلسفۂ قدیم میں ایک یہ نظریہ بھی ملتا ہے کہ انسان اپنی روح کو ملوث کئے بغیر بھی جسم سے گناہ کر سکتا ہے۔ یعنی اگر جسم گناہ کرے تو لازمی نہیں کہ روح بھی ملوث ہو۔ نظیر کا غزلیہ کلام دیکھئے

سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً وہ اسی مسلک کے آدمی تھے۔ نظیر نے اپنی کامرانیوں کو "فطرتیت" کے پردازمیں بیان کیا ہے اور ذوق حصول و جرأت رندانہ کے مشرب کو سراہا ہے۔ لیکن جہاں کہیں محبت کے مسئلہ پر اپنے تأثرات و حسیات بیان کئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی محبت مطمحی اور مثالی تھی۔ یا پھر میاں نظیر کے سامنے روح و جسم کے جداگانہ متأثر ہونے کا نظریہ ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میاں نظیر کی "لذتیت" اور اُن کی مطمحی محبت دونوں اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہوں اور ایک درجہ طے کر لینے کے بعد دوسرے تک پہونچے ہوں۔ یہی زیادہ قرین قیاس ہے کہ ترقی عمر کے ساتھ نظریۂ محبت میں تغیر ہوا ہو۔ افسوس کہ کلام کی تاریخی ترتیب نہ ہونے کی وجہ سے ہم اس بات کو مدلل نہیں کر سکتے۔ الغرض اُنکی محبت کا مقصود "ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش وقت ہوئے اور چل نکلے" ہے۔ اُنھوں نے اپنے اس نظریئے کو مختلف پیرایوں میں ادا کیا ہے اور اسی کی تفسیر و تشریح کی ہے:۔

آ گئے تھے سیر کرتے، تم کو دیکھا، خوش ہوئے — بس خدا حافظ ہے ہم اے یار رخصت ہو چلے

ایک جگہ اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ اصل عشق، عشق ذات ہے، عاشق صفات کو نہیں دیکھتا:۔

فقط جو ذات کے ہیں دل سے چاہنے والے — اُنھیں کرشمہ و ناز و ادا سے کیا مطلب

محبت اگر حقیقی ہو تو عاشق کا دل بس جذبۂ پرستش اور احترام سے لبریز ہوتا ہے۔ ایک شعر میں نظیر نے اپنے جذبے کی پاکیزگی اور اپنے محبوب کی تنزہت ہی کے مانند ایک پاکیزہ ندیم پیدا کیا ہے۔ وہ نسیم کو مخاطب کر کے اپنی محبت کو اُس کی محبت سے زیادہ مقدس ثابت کرتے اور کنایتاً اُس کی پیہم بوسہ بازی پر ایک طنز کر جاتے ہیں:۔

اُس کی جبین پاک پہ اس دم تک اے نسیم — کافر ہوں، گر پڑی ہو نگہ، بے وضو مری

محبت میں دل کی جراحتیں مسلم ہیں اور منہ سے ایک آہ تک جانا بھی بالکل فطری۔ نظیر خود کو ورائے بشریت ثابت نہیں کرتے۔ لیکن عشق کی وفا پیشگی کو بہرحال مقدم رکھتے ہیں:۔

اظہار ہم بھی کرتے احوال دل فگاری — شرم وفا مگر اکدم دیتی زباں کو یاری

محبت میں مدارج ہیں، نظیر کو بھی عشق کے تجربات ہوتے ہیں اور وہ اپنے لئے ایک محفوظ نتیجہ نکال لیتے ہیں:۔

دل جس کو چاہتا ہے اُسے بھی خبر نہ ہو — اپنی تو فہم میں ہے یہی راہ سب سے خوب

نظیر فلسفۂ زندگی کے ماہر ہیں، وہ زندگی کے مختلف مظاہر کو سمجھتے ہیں، اس لئے عشق کا حاصل بھی جانتے ہیں کہ اُس کی انتہا بس ایک آہ دلگداز ہے۔ لیکن وہ اسے بھی پست سمجھتے ہیں اور مطمئن نہیں، کیونکہ اُن کی نظر میں یہ کمال عشق (یعنی ایک آہ) بھی طالب اثر ہے اور طلب اثر ہے جو ایک تمنا ہے، عشق کو بلند ہونا چاہئے:۔

کمال عشق بھی خالی نہیں تمنا سے — ہے ایک آہ تو اس کو بھی ہے اثر کی طلب

محبت کی لذت کو نظیر اپنے ہی لئے رکھنا چاہتے ہیں، اور کسی کو اُس کی خبر دینا اُنھیں گوارا نہیں ہے:۔

لطف جو چاہت کے ہیں سو وہ جتانے نہیں چاہ چھپی کیجئے تا کوئی جانے نہیں،

محبت کرنا اور یہ آرزو نہ کرنا کہ محبوب بھی ہمیں چاہے، بڑا درجہ ہے۔ لیکن محبوب کو یاد کرنا اور یہ چاہنا کہ وہ ہمیں یاد نہ کرے، انتہا ہے۔ نظیر اس آرزو میں کامیاب ہو کر اس خوش قسمتی کا اعلان کرتے اور خوش ہوتے ہیں:-

خوش نصیبی مری اُلفت کی تو دیکھو یارو یاد کرتا ہوں جسے میں، وہ بھلاتا ہے مجھے!

اس شعر میں نظیر نے خیال کو اُس بلندی پر پہونچا دیا جہاں پہونچا دینا خیال میں نہ آسکتا تھا۔

علم و حکمت

غزل کے شعر میں خصوصاً علمی مسائل کا بیان غیر موزوں سی بات ہے۔ لیکن شاعر اگر عالم بھی ہے تو ناممکن ہے کہ اُس کے شعر ایسے مسائل سے پاک رہیں۔ اُردو شاعری میں فلسفے کا بیان غالب کی خصوصیت ہے۔ مومن کے یہاں بھی مسائل حکمیہ کی کمی نہیں۔ میرا یہ مقصود تو ہرگز نہیں کہ نظیر کو بھی عالم یا سائنس داں کہہ کر پیش کیا جائے، کیونکہ اگر وہ ایسے ہوتے بھی تو شاعری کے لئے یہ چیز کوئی وجہ تفاخر نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ دکھانے کے لئے کہ ایک شاعر میں جو بصیرت ہونا چاہئے وہ نظیر کو بخوبی حاصل تھی اور وہ اِن حقیقتوں تک پہونچ جاتے تھے، چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔ نظیر اپنی اس حیثیت سے خود بھی باخبر ہیں۔ کہتے ہیں:-

حکمت کا اُلٹ پھیر نہیں جن کی نظر میں وہ کہتے ہیں غافل "یہ بقا ہے یہ فنا ہے"

آغاز حیات پانی سے ہے، نظیر اس نکتہ سے لاعلم نہ تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ شاعر کا پانی "آب رخ" ہے:-

آب رخ کیا، کہ اسی سے ہے حیات ہر شے شاہد اس بات کی ہے حی من الماء کی صدا

سورج کی کرنیں زمین پر بسنے والی مخلوق کے ساتھ کیا کیا شعبدہ بازیاں اور کیسی کیسی سحر کاریاں کرتی ہیں ہائڈروجن اور آکسیجن کا مدار آفتاب کی شعاعوں پر کہاں تک ہے؟ یہ سب سائنس کے مسلمات ہیں یہ راز نظیر پر غیر منکشف نہ تھا

خورشید جس سے لعل کی ہوتی ہے تربیت وہ اُن لبوں کے پان کا ادنیٰ اُگال ہے

خواہش میں اُلوہیت ہے، یعنی طلب اگر صادق ہے تو آرزو کا بر آنا یقینی ہے۔ لیکن ہر آرزو، آرزو نہیں ہو سکتی اور اس کے لئے کوئی پیمانہ و اندازہ ضروری تھا۔ نظیر نے یہ پیمانہ ایک شرط لگا کر پیش کیا ہے، شرط بھی کتنی جامع و مانع! اور ساتھ ہی ایک درس حیات بھی دیدیا ہے:-

آرزو خوب ہے، موقعے سے اگر ہو، ورنہ اپنے مقصود کو کم پہونچے ہیں بسیار طلب

انگریزی زبان میں ایک جملہ ضرب المثل کے طور پر اکثر بولا جاتا ہے جسکا مفہوم ہے کہ ساغر کے لبوں تک پہونچنے میں چھلک جانے کے بہت سے امکان ہیں۔ نظیر انگریزی تو یقیناً نہیں جانتے تھے، مگر اُنکی بصیرت اتنی تھی کہ یہ عندیہ اُن کے خیال کی رسائی سے بچ نہ سکا:-

کیا کاسۂ مے لیجئے اس بزم میں اے ہمنشیں دورِ فلک سے کیا خبر پہونچے گا کب تک یا نہیں

زندگی کی واقعیتیں

زندگی اگر عالم رویا کی زندگی ہوتی تو نہایت خوب چیز تھی - مگر زندگی نام ہے بیدار لمحوں کا اور بیداری میں زیست کی تلخیاں اٹل اور سخت ہیں - ان تلخیوں کے گوارا ہو جانے کا صرف ایک ہی نسخہ ہے اور وہ حکیمانہ نقطۂ نگاہ ہے - نظیر نے ان تلخ حقیقتوں کے راز اکثر کھولے ہیں - اگرچہ اس قسم کے خیالات کے اظہار کا ذریعہ نظم کو بنایا ہے، مگر غزل کے اشعار میں بھی ایسے خیالات بیان کر جاتے ہیں :-

ہو کس طرح نہ ہم کو ہر دم ہوائے مطلب — دیکھا جو خوب ہم نے، دنیا ہے جائے مطلب
وہ آبرو کہ جس پر کرتے ہیں جاں تصدق — اُس کو بھی دے چکے ہیں، اکثر برائے مطلب
ملنا بھی غرض کا ہے لڑائی بھی غرض کی — نہیں اور کسی سے کوئی روٹھا نہ منا ہے
ہم کیوں نہ اپنے آپ کو روئیں جیتے جی، — اے دوست کون بھر کرے ماتم فقیر کا
سچ ہے بقول حضرت سید نظیر، آہ، — بن آتی ہے تو ہوتی ہیں سب باتیں ٹھیک ٹھیک

خوشی کے فلسفہ کی یہ تعریف شاید ملٹن نے کی ہے کہ انسانی مسرت کا ماحصل سب کے لئے یکساں ہے میاں نظیر اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے :-

اگرچہ اہل نوا خوش ہیں ہر طرح، لیکن، — زیادہ اُن سے ہے ہر بے نوا کو عیش و طرب
کمال قدرت حق ہے نظیر کیا کہئے — جو شاہ کو ہے، وہی ہے گدا کو عیش و طرب

نظیر کا فلسفۂ زندگی

زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تفسیر و تشریح اگرچہ نظیر کے کلام میں ملتی ہے، لیکن مجموعی طور سے اُنھوں نے بھی اُسے "نکشودہ معما" ہی مانا ہے - وہ ہر شے اور ہر حالت کو بڑی شدت سے گزشتنی مانتے ہیں - اسی لئے ہر حال میں خوش ہیں :-

ہستیٔ انسان کی حقیقت یا خودی کا احساس نظیر کو کس طرح ہوتا ہے ؟ کہتے ہیں :-

سب غلط ہے یہ جو کہتے ہیں کہ ہم میں کچھ نہیں — کچھ نہیں ہم میں تو ہستی و عدم میں کچھ نہیں

ہستیٔ انسان کی غایت اور مقصود کا اعتراف تو نظیر کرتے ہیں، لیکن انسان کس خاص کام کے لئے پیدا ہوا ہے اسکو ناگفتہ ہی چھوڑ دیتے ہیں :-

جس کام کو جہان میں آیا تھا تو نظیر — خانہ خراب ! تجھ سے وہی کام رہ گیا

ہستیٔ انسان اور زندگی کی کشمکش اور غفلتوں کو نظیر جس طرح سمجھے ہیں، وہ ذیل کی غزل میں ایک جگہ نظر آجاتا ہے اس غزل میں نظیر کا مصلحانہ رنگ بھی ہے جسے میں نے الگ نہیں دکھایا ہے :-

جو تو کہتا ہے اے غافل "یہ میرا ہے یہ تیرا ہے" — یہ جس کا ہے اُسی کا ہے، نہ تیرا ہے نہ میرا ہے
تو اول سوچ تو دل میں کہ تو ہے کون اور کیا ہے — نمازی ہے، شرابی ہے، اُچکا ہے، لٹیرا ہے

فرشتہ ہے، پری ہے، دیو ہے یا آدمی، جن ہے
بلا ہے، بھوت ہے، بامن، مزورا یا کمیرا ہے

تیری کیا ذات ہے، کیا نام ہے، کیا کام کرتا ہے
مسافر بے وطن ہے، یا ترا اس جا پہ ڈیرا ہے

جب ان چیزوں سے تو اپنے تئیں کچھ چیز ٹھیرا دے
تو اُس کے بعد پھر کہیو کہ "یہ تیرا یہ میرا ہے"

یہ چیزیں تو غرض کیا ہیں، تو اپنا ہی نہیں مالک
تجھے او بے خبر ناداں یہ کس غفلت نے گھیرا ہے

تو کچے سوت کا دھاگا عبث بل پیچ کھاتا ہے
یہ سب وہم غلط ہے اور قصور فہم تیرا ہے

تو کیا جانے کہ تجھ کو کس نے کس چرخے میں کاتا ہے
تو کیا جانے کہ تجھ کو کس اٹیرن میں اٹیرا ہے

تماشا ہے، مزا ہے، سیر ہے کیا کیا، اہا ہا ہا
مصور نے عجب کچھ رنگ قدرت کا بکھیرا ہے

ترقی میں تنزل ہے، تنزل میں ترقی ہے
اندھیرے میں اُجالا ہے، اُجالے میں اندھیرا ہے

طلسمات حقیقی ہے، یہ کچھ سمجھا نہیں جاتا
یہی چاند اور یہی سورج، یہی شام اور سویرا ہے

نظیر اللہ اللہ، اس جہاں میں دم غنیمت ہے
کہاں ہم اور کہاں پھر تم، کوئی دم کا بسیرا ہے

میر کا انداز

محمد حسین آزاد نے نظیر کے چند شعروں کو میر کے انداز کا لکھا ہے۔ اُس کے لکھنے کا پردا یہ ہے کہ گویا یہ چیز نظیر کے لئے فخر و مباہات کا موجب ہے کہ وہ میر کے رنگ میں چند شعر لکھ سکے۔ مجھے آزاد کے اس خیال سے مطلق اتفاق نہیں۔ میر کے رنگ میں کامیاب ہو جانا نظیر کے مقصد شاعری کے لئے باعث ننگ تھا۔ نظیر کی شاعری کا مسلک میر کے راستے سے بالکل جدا اور نہایت وسیع ہے۔ نظیر زندگی کے مفسر ہیں اور میر محض محبت کے ماتم گسار۔ میر کی شاعری میں فلسفۂ حیات معدوم اور نظیر کے یہاں بس یہی ایک چیز سارے عالم پر محیط ہے۔ اسلئے میر و نظیر کا تقابل کوئی معنے نہیں رکھتا۔

لیکن جہاں تک جذبات محبت کے احساس و اظہار کا تعلق ہے، میر کے یہاں صحیح احساس اور کامل اظہار ہوا ہے۔ مگر نظیر نے ان احساسات کے اظہار میں ذرا سے تفلسف سے بھی کام لیا ہے۔ نظیر کے احساسات محبت کی صداقت کے اظہار کو اُن کے فلسفہ نے تھوڑا سا سنجیدہ بنا دیا ہے۔ جذبات محبت میں گداز کا ہونا لازمی ہے اور اُسی کے دلنشین بیان نے میر کی انفرادیت قایم کی ہے۔ نظیر کے یہاں نیاز عاشقانہ ہے، لیکن میر کی سی فتادگی کم ہے، گو تغزلی احساس کے اظہار کا پرداز کچھ مماثل ہو جاتا ہے :-

آیا وہ جب تو ہم نہ رہے اپنے آپ میں — دیکھا اسی طرح سے اُسے ہم نے بارہا
یوں تو ادا و ناز سب آتے ہیں اُس کے یاد — مسنا پر ایک اُس کا نہیں دل سے بھولتا
ہوا جو ہم کو وہ کوچہ چمن سرشت نصیب — خدا نے ہم کو اُسی جا کیا بہشت نصیب
کوچے سے اُس کے آتا ہوں یوں ہو کے نا اُمید — نوکر شکستہ حال کو جیسے ملا جواب

اتنا تو نامہ بر سے نہ ہوتا میں شرمسار — اے کاش بھیجتا وہ برا یا بھلا جواب
آگے ہی دل اپنا تو یہ سودائی ہے کم بخت — اور تس پہ سنا یہ کہ بہار آئی ہے کم بخت
نہ جاؤں میں تو اُس کے پاس لیکن کیا کروں یارو — یکایک کچھ جگر میں آکے لگ جاتا ہے نشتر سا
دل سا در یتیم بکا، ایک نگہ کے مول، — کیا کہئے، خیر، یہ بھی خریدار کے نصیب
گئے تھے ملنے کو شاید جھڑک دیا اُسنے — میاں نظیر تو کچھ شرمسار آتے ہیں
اُلفت نے اُس کی اوج یہ ہم کو دکھا دیا — جو رفتہ رفتہ خاک میں آخر ملا دیا

مضامین کا توارد — نظیر کے یہاں ایسے مضامین اور خیالات پائے جاتے ہیں جو شعرائے ماقبل کہہ گئے تھے اور وہ بھی ہیں جو بعد کے شعرا نے لکھے ہیں۔ یہ انتخاب نہ تو ارادتاً تھا اور نہ ضروری لیکن دوران مطالعہ میں اگر ذہن نے کوئی ہم مضمون یا قریب المفہوم شعر پیش کر دیا تو نشان لگا دیا تھا۔ غالباً چند شعروں کا تقابل غیر دلچسپ نہ ہوگا:—

غالباً خاقانی کا شعر ہے:—

من بندۂ آں مَیم کہ ساقی گوید — یک جام دگر بگیر و مستی نتوانم

نظیر کہتے ہیں:—

ساقی ہمیں پلائے یوں جام پے بہ پے — جو ہم نشہ میں کہہ اُٹھیں اکبار بس جی بس

حافظ کا مشہور شعر ہے:—

بملازمان سلطان کہ رساند این دعا را — کہ بشکر بادشاہی تو ز در مراں گدا را

نظیر کہتے ہیں:—

مجھے وہ پوچھے تو یہ اُس کا لطف ہے ورنہ — وہ بادشاہ ہے اُسے مجھ گدا سے کیا مطلب

مرزا مظہر جانجاناں کا شعر ہے:—

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو — یہی ایک شہر میں قاتل رہا ہے

نظیر کہتے ہیں:—

نہ ٹوکو دوستو اس کی بہار نام خدا — یہی اب ایک ہے یاں گلعذار نام خدا

سودا و نظیر ایک ہی وقت میں تھے۔ سودا کا یہ مشہور شعر فارسی کا چربہ ہے:—

کیفیت چشم اُس کی مجھے یاد ہے سودا — ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

نظیر کہتے ہیں:— خدا کے واسطے گلگوں نہ میرے ہاتھ سے لو — مجھے بو آتی ہے اس میں کسی بدن کی سی

نظیر کا شعر ہے :-

جہاں بھی خواب ہے اور ہم بھی خواب ہیں اے دل — عجب بہار کا دیکھا ہے ہم نے خواب میں خواب

غالب کہتے ہیں :-

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

نظیر کا شعر ہے :-

تھے کل یہ خط عارضِ خوبانِ سبزہ رنگ — کہتی ہے آج خلق جنھیں سبزہ زار ہا

غالب کہتے ہیں :-

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

نظیر کا شعر ہے :-

ان سنگدل بتوں کا گلہ کیا کروں نظیر — میں آپ اپنے شیشۂ دل کی شکست ہوں

غالب کہتے ہیں :-

سن اے غارتگرِ جنسِ وفا سن — شکستِ شیشۂ دل کی صدا کیا

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز — میں ہوں اپنی شکست کی آواز

نظیر کا شعر ہے :-

مر کر بھی تہ خاک نہ آسودہ ہوئے آہ — اے عشق نہ تجھے ہم ترے انجام سے واقف

ذوق کہتے ہیں :-

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

نظیر کا شعر ہے :-

ابھی کہوں تو کسی کو نہ اعتبار آوے — کہ ہم کو راہ میں ایک آشنا نے لوٹ لیا

شیفتہ کہتے ہیں :-

ابھی کہوں تو کریں لوگ شرمسار مجھے — کہ کس کے وعدے پہ اتنا ہے اعتبار مجھے

نظیر کا شعر ہے :-

یوں جھمکتا ہے رخ اُس محبوب کا زیرِ نقاب — ہو نمایاں جس طرح ابر تنک میں آفتاب

غالباً جلیل نے کہا ہے :-

رنگت یہ رخ کی اور یہ عالم شباب کا — آنچل میں تم تو پھول لئے ہو گلاب کا

نظیر کا شعر ہے :-

نا برق ، نہ خورشید نہ شعلہ نہ بھبوکا
کیوں صاحبو یہ حسن ہے یا اور ہی کچھ ہے

جلیل کہتے ہیں :-

نگاہ برق نہیں ، چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے ولے دیکھنے کی تاب نہیں

نظیر کا شعر ہے :-

چمک جا پھر خدا کے واسطے اے طور کے شعلے
کہ مثل آتش افسردہ ہے دل پھر کچھ چلا کمہلا

جگر کہتے ہیں :-

ہنسی پھر اڑنے لگی عشق کے فسانے کی
نقاب اٹھاؤ ، بدل دو ہوا زمانے کی

عام انتخاب

گردوں نے ہمکو کیا نہ دیا اور کیا دیا
سب کچھ دیا اگر دل بے مدعا دیا
خواب عدم میں ہم تو فراغت سے اے نظیر
سوتے تھے عشق نے مگر آکر جگا دیا

یہ کچھ بہروپ بن دیکھو کہ بن کر شکل دانے کی
بھرنا ، سبز ہونا ، لہلہانا ، پھر سمٹ جانا
یہ یکتائی ، یہ یکرنگی ، تس اوپر یہ قیامت ہے
نہ کم ہونا نہ بڑھنا ، اور ہزاروں گھٹائیں بٹ جانا

جو ہم میں شوخیاں تھیں جوانی میں اب کہاں
اُن بے وقوفیوں کا اک الزام رہ گیا

شراب و گلبدن ساقی ، مزے عیش و طرب ہر دم
بہار زندگی کہئے تو ہے موسم جوانی کا
یہ بوڑھے گو کہ اپنے منہ سے سختی میں نہیں کہتے
بھرا ہے آہ ، پر ان سب کے دل میں غم جوانی کا
یہ پیران جہاں اس واسطے روتے ہیں اب ہر دم
کہ کیا کیا ان کا ہنگامہ ہوا برہم جوانی کا
نہیں بوڑھوں کی داڑھی پر میاں یہ رنگ دسمے کا
کیا ہے آکے ایک ایک بال نے ماتم جوانی کا

اٹھا کے سینہ ، جھٹک بازو اور بنا سج دھج
چلے ہے جس گھڑی ٹھوکر کو مار نام خدا
قدم قدم پہ برہمن پڑھیں ہیں بسم اللہ
صنم بھی کہتے ہیں سب بار بار نام خدا
نشہ کی اب تلک آنکھوں میں کچھ نہ تھی مستی
پر اب کچھ آتا چلا ہے خمار نام خدا

دیکھنا ہمدم یہ اترا سنبلستاں میں قمر
یا تو کاکل کسی کے چمکے ہے بالا پڑا

وہ بالا سا قد اُس کا اور وہ بالا کان کا یارو
کریں ہیں اُس پری کے بالے جو بن کو دو بالا سا

طرح دینا، اُڑا دینا، لگا دینا، بجھا دینا
یہ ڈھب ہیں یاد، تس پر کچھ فریب اور فن نہیں آتا

چمنِ حسن میں اے نوگلِ بستانِ جمال
تو وہ گل ہے کہ بصد حسن جہانگیر کھلا
محو تدبیر ہیں ہم لیک خدا ہی جانے
کون سا گل ہے پس پردۂ تقدیر کھلا

وصف اُس کے حسن کا کس سے ہوا کلی مگر
جس کے جتنا فہم میں آیا، کہا، اچھا کہا

جدھر کو دیکھے اُدھر آپ ہی جھکتا ہے
مزا پڑے نہ اُسے کیوں کہ شیش محلوں کا
کہا میں یار سے ایک دن کہ دل یہ چاہے ہے
طریق جیسے ہے عشرت کے اسپلے گہلوں کا

ایک نظر گو تجھے دیکھ لیں، شاد ہی رہیے
ہے کہ لگیں چار جانب، حد کہ چار آفتاب

کیسا ہی وہ برا ہو تو لگ جائے جس سے دل
لگتا ہے دل کو پھر وہی واللہ سب سے خوب

عشق میں اُس گوہر نایاب کے
آج تلک خشک ہیں دریا کے لب

یہ جواہر خانۂ دنیا جو ہے با آب و تاب
اہل صورت کا ہے دریا اہل معنی کا سراب

اے مری جان ہمیشہ ہو تری جان کی خیر
ناز کی دور بلا حسن کے سامان کی خیر

سو چمن ایک فقط اُسکے ہیں بکھڑے ہیں نظیر
جب یہ صورت ہو تو پھر کس کو خدا یاد رہے

ایام شباب اپنے بھی کیا عیش اثر تھے
کہتے ہیں جنھیں عیب وہ اُسوقت ہنر تھے

ہے حسن پرستی بھی عجب چیز وفا کیش، دل پیر بھی ہو جائے پر اُس کا نہ اثر جائے

پہلے ہی ساغر میں تھے ہم تو پڑے لوٹتے استنے میں ساقی نے دی اُس سے کڑی اور بھی

خاتمۂ کلام المختصر یوروپ کی ترقی تمدن و علوم نے شعر و ادب کا جو معیار مقرر کیا ہے اور تنقید کا جو پیمانہ قایم کیا ہے، نظیر نہ صرف اُس معیار کے شاعر ہیں اور اُس پیمانے پر پورے اُترتے ہیں، بلکہ عہد حاضر میں ادب کے متعلق جو نظریات جاری و ساری ہیں وہ بھی نظیر کے کلام سے مستنبط ہوتے ہیں

مجھے احساس ہے کہ نظیر کے غزلیہ کلام سے جو اشعار مثالاً پیش کئے گئے ہیں، اُن کی تعداد بڑھ گئی ہے اور عجب نہیں کہ بعض طبیعتوں پر گراں بھی ہو، لیکن معذرت کی درخواست کے ساتھ یہ عرض ہے کہ ایسا بالقصد کیا گیا ہے، چونکہ یہ کلام چھپا نہیں ہے، اس لئے جتنا زیادہ حصہ لوگوں کے سامنے آسکے نظیر کے متعلق بہتر رائے قایم کرنے میں مدد دے گا۔

(ہندستانی) لطیف الدین احمد اکبر آبادی

رامپور اسٹیٹ

پبلک سروس کمیشن - یو۔پی

ترمیم

کمیشن کے پچھلے اشتہار مورخہ ۲۸ر اکتوبر ۱۹۳۸ء میں (جس میں ویدوں اور اطبا کی جگہوں کے لئے درخواستیں طلب کی گئی ہیں) حسب ذیل ترمیم کی جاتی ہے۔

(۱) امیدوار کے لئے لازم ہے کہ وہ (الف) یا تو ایورویدک کالج بنارس ہندو یونیورسٹی یا طبیہ کالج علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کا سند یافتہ ہو۔ (ب) یا بورڈ آف انڈین میڈیسن صوبجات متحدہ کا رجسٹرڈ وید یا طبیب ہو۔

ان امیدواروں کو جو کہ آیورویدک کالج یا طبیہ کالج مذکورۂ بالا کے سند یافتہ ہوں گے ترجیح دیجائے گی۔

(۲) امیدوار کی عمر یکم دسمبر ۱۹۳۸ء کو بیس ۲۰ سال سے کم اور پینتالیس ۴۵ سال سے زیادہ نہ ہونا چاہئے۔

(۳) درخواستیں بجائے ۵ر دسمبر ۱۹۳۸ء کے ۱۵ر دسمبر ۱۹۳۸ء تک سکریٹری صاحب پبلک سروس کمیشن۔یو۔پی الہ آباد کے پاس پہونچنا چاہئیں۔

مصدورہ الہ آباد

مورخہ ۱۲ر نومبر ۱۹۳۸ء

کتابوں کی یونیورسٹی

چند سال ہوئے میں آل انڈیا لائبریری کانفرنس کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے جس کا اجلاس لاہور میں ہونے والا تھا علامہ سر محمد اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے درخواست کی کہ وہ مجلس استقبالیہ کی صدارت قبول فرمائیں علامہ موصوف نے میری استدعا کو نہایت خندہ پیشانی سے سُنا لیکن آپ نے نہایت شائستگی مگر صاف گوئی کے ساتھ فرمایا کہ وہ میری درخواست کو منظور نہیں کر سکتے میں انتہائی مایوسی کے عالم میں وہاں سے رخصت ہونے ہی والا تھا کہ انھوں نے مجھ سے دریافت کیا "کیا کتب خانے کوئی کام کی چیز ہیں اور کیا کتابوں کے مطالعہ سے کچھ فایدہ حاصل ہوتا ہے"۔ ان کے اس سوال کا میں اسوقت کوئی جواب نہ دے سکا اور عرصہ تک میرے دماغ میں یہ سوال گونجتا رہا۔ میں حیران تھا کہ اقبال ایسے فاضل انسان کو کتابوں کے مطالعہ سے اسقدر نفرت کیوں ہے۔ کم از کم علامہ کے سوال سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا اور اس کے کوئی اور معنی نہ سمجھ سکا۔ مجھے امید نہ تھی کہ صاحب موصوف نے میرے ساتھ وہی طرزِ عمل اختیار کیا ہوگا جو ایک ممتحن زبانی امتحان میں کسی طالب علم کے ساتھ اختیار کرتا ہے، ممدوح کا یہ مقصد کبھی نہ رہا ہوگا کہ وہ میری معلومات کا امتحان لیں یا میری قوت تشریح و ترغیب کو پرکھیں، یقیناً سوال میں اس سے کچھ زیادہ گہرائی تھی، اس میں کتابوں اور ان کے مطالعہ کے متعلق اس بے اعتمادی کا اظہار تھا جس کے متعلق اور مفکرین بھی روشنی ڈال چکے ہیں۔

اس سوال پر غور و فکر کے اثنار میں میرے سامنے اور بھی ایسے ارباب فکر آئے جو اس اصول کے قطعاً منکر تھے کہ کتابوں کے مطالعہ سے عقل و دانائی پیدا ہوتی ہے مجھے اسٹیونسن کے "کاہل" کا خیال آیا۔ اس نے اپنے دلچسپ مقالہ "کاہلوں کے لئے ایک اعتذار" میں، کتابوں کے مطالعہ کے خلاف ایک زبردست احتجاج کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ "جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے اپنے زمانہ میں بہت کافی لکچر سنے ہیں مجھے ابھی تک یاد ہے کہ لٹو کا گھومنا حرکت کی سکون کی ایک صورت ہے اور یہ بھی یاد ہے کہ حق شفع کوئی مرض نہیں ہے اور نہ طلب حق آسایش کوئی جرم ہے لیکن اگرچہ میں اپنی معلومات علمی کے ان جواہر پاروں سے بخوشی محروم ہونا نہ پسند کروں گا تاہم میں ایک لمحہ کے لئے بھی تیار نہیں ہوں کہ ان معلومات کو وہی اہمیت دوں اور ان کی وہی قدر و قیمت سمجھوں جو میں نے اسکول سے

غائب ہو کر آوارہ گردی میں حاصل کی ہے" اس سے وہ یہ استدلال کرتا ہے کہ کتابوں کا بہت زیادہ مطالعہ فضول ہے، اس کی قدر و قیمت ایک شمعدان کی سی بھی نہیں ہے کیونکہ یہ ہماری زندگی پر (جس طرح ہم اس کو بسر کرنا چاہتے ہیں) بہت کم اثر انداز ہوتی ہے، مزید براں اس کا اعتقاد ہے کہ کتابیں ہم کو زندگی کے اُن مکمل و صحیح تعلقات سے بیگانہ بنا دیتی ہیں، جو فی الحقیقت بہت کار آمد ہیں۔ ایک کتابی آدمی "لیڈی آف شیلاٹ" کی طرح ہے جو زندگی کو اپنے اصلی خد و خال میں بمشکل دیکھ سکتی تھی، بلکہ وہ صرف ان پرچھائیوں پر قانع تھی جو آئینہ میں اسے نظر آتی تھیں ایسا شخص جو مسلسل کتابوں کے مطالعہ میں لگا رہتا ہے، تجربہ اور مشاہدات کا لطف صرف ثانوی حیثیت سے حاصل کرتا ہے، وہ حقایق کی دنیا سے الگ، صرف بھوتوں، پرچھائیوں اور دھندلی شکلوں کی دنیا میں رہتا ہے، وہ ان چیزوں کا مطالعہ کرتا ہے جو دوسروں نے انجام دئے ہیں، جنھیں اوروں نے سوچا اور کہا ہے اور اس حقیقت کو بالکل فراموش کر دیتا ہے کہ اسے خود بھی غور و فکر کی حساس زندگی بسر کرنا ہے۔ آگے چلکر وہ کہتا ہے کہ کتابوں کا مطالعہ انسان کو اس عجیب و غریب دنیا سے الگ کر دیتا ہے جس کے محاسن و معائب کا مطالعہ وہ خود اپنی آنکھوں سے کر سکتا ہے۔ کتابوں کا عاشق بالکل تن آسان اور بے حس زندگی کا عادی ہو جاتا ہے وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتا کہ فراہمی معلومات کے لئے اپنے حواس ہی کام میں لائے جا سکتے ہیں۔ اس کے لئے آکسفورڈ کے یہ فضا میدانوں کا وجود صرف میتھو آرنلڈ اور رابرٹ بریجز کی نظموں میں پایا جاتا ہے اور بلبل کے نغمے صرف حافظ کی مترنم غزلوں میں وہ صرف ان پھولوں کی خوشبو سونگھتا ہے جن کو کیٹس نے اپنی بہاریہ نظم میں پیش کیا ہے اور اس کو کسی صحبت کی مسرتوں کا اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اسکا ذکر کسی تذکرہ یا سیاحت میں پڑھتا ہے، الغرض دنیا کی بہترین چیزوں سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت اس سے مفقود ہو جاتی ہے اور کائنات کے گوناگوں مناظر و مظاہر اس کے لئے بالکل ناممکن الفہم۔

کتابیں صرف ہماری قوت مشاہدہ ہی کو معطل کر دیتی ہیں بلکہ وہ اکثر ہماری آنکھوں کو زندگی کے عملی پہلو کی طرف سے بند کر دیتی ہیں اور نپٹ مکتبی اور ملاٹا بنا دیتی ہیں، تورو نے نہایت واضح اور مدلل طور پر اپنی کتاب والڈن میں اس موضوع پر بحث کی ہے۔ یہ امریکی مصنف جو عصر جدید کی میکانیکی اور مذموم تہذیب سے قطعاً کوئی ہمدردی نہیں رکھتا تھا، صرف اصول فطرت تبلیغ کرتا تھا اس نے اپنے وطن کو جو عہد حاضر کے جملہ اسباب عیش و نشاط سے آراستہ تھا، خیرباد کہکر ایک تالاب کے قریب رہنا اختیار کیا، اور یہاں جدید طرز زندگی کے شور و غوغا سے علیحدہ ہو کر اس نے جدید تہذیب کی اساس و بنیاد پر غور کرنا شروع کیا اور اس نتیجہ پر پہونچا کہ یہ سب مکر و فریب ہے۔ اُس نے ان تمام اداروں کا تجزیہ شروع کیا جن کو آج کل کا مہذب انسان اجتماعی روشن خیالی کے ادارے ظاہر کرتا ہے اور اس نے محسوس کیا کہ یہ سب بے حقیقت ہیں۔ اس نے امریکہ کے رائج الوقت نظام تعلیم کو جس میں

کتابوں کے ذریعہ سے علم سکھانے پر زور دیا جاتا ہے۔ بالکل ناقص قرار دیا۔ یہ کتابی تعلیم زندگی کے حقایق سے قطعاً محروم کر دیتی ہے اور اس لئے بالکل بے معنی ہے۔ اس نے ایک خطیبانہ انداز سے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے "نوجوان کیونکر بہتر زندگی بسر کرتے ہیں؟ اس کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ ابتدا ہی سے ذاتی تجربات حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اگر میں یہ چاہوں گا کہ کوئی لڑکا فنون و علوم سے واقفیت حاصل کرے تو میں رائج الوقت روش کبھی اختیار نہیں کروں گا جس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ایک بچے کو کسی پروفیسر کے پڑوس میں رکھا جائے جہاں زندگی گزارنے کے فن کے سوا اور تمام باتیں بتلائی اور سکھلائی جاتی ہیں اور جہاں دنیا کا صرف سطحی مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔ جہاں علم الکیمیا سکھلایا جاتا ہے لیکن یہ نہیں بتلایا جاتا کہ اس کی روٹی جو وہ روز مرہ کھاتا ہے کس طرح بنتی ہے، یا جہاں میکانیک کی تعلیم دیجاتی ہے لیکن نہیں سکھایا جاتا کہ معاش کس طرح حاصل کی جاتی ہے یا جہاں پنچون سیارہ کے نئے چاندوں کا دریافت کرنا سکھایا جاتا ہے لیکن یہ نہیں بتلایا جاتا کہ وہ خود اپنی آنکھ کے تنکے کا کس طرح پتہ لگائے۔ آپ کے سامنے دو بچے ہیں، ایک وہ جس نے اپنا جیبی چاقو اس دھات کے ٹکڑے سے بنایا ہو جسے اس نے خود کھود کر نکالا تھا اور گلا کر صاف کیا تھا لیکن پڑھا صرف اتنا ہی تھا جتنا کہ اس کام کے انجام دینے کے لئے ضروری تھا اور دوسرا لڑکا وہ ہے جس نے معدنیات پر بہت سے لکچر سنے ہوں اور اپنے شفیق باپ سے ایک چاقو بطور انعام پایا ہو۔ پھر آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ ان دونوں لڑکوں میں سے کون زیادہ کارآمد ہے۔ میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب مجھے اپنے کالج کے ایام کے اختتام پر بتلایا گیا کہ مجھے فن جہاز رانی سکھلایا گیا ہے درانحالیکہ اگر میں نے کسی جہاز کے اندر کام کر کے بندرگاہ کے گرد ایک چکر بھی لگا لیا ہوتا تو مجھے اس سے کہیں زیادہ معلومات حاصل ہو جاتیں، ایک طالبعلم کو معاشیات و اقتصادیات کی تعلیم تو دیجاتی ہے لیکن زندگی کیونکر کفایت شعاری کے ساتھ بسر کی جاتی ہے اسکی تعلیم نہیں دیجاتی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے والدین کو ناقابل ادا قرض کی مصیبت میں گرفتار کر جاتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ کتابوں کے مطالعہ کے خلاف اس سے زیادہ پرزور احتجاج شاید ہی کسی نے کیا ہو تورو کے قول کے مطابق کتابیں فی الحقیقت خود اپنے ہی مقاصد کو شکست دے دیتی ہے کیونکہ یہ ہم کو حقایق کی دنیا سے نکال کر محض خیالی شکلوں اور غیر حقیقی صورتوں کے عالم میں گم کر دیتی ہیں۔

کتابوں کا مطالعہ دوسرے قسم کے خطرات میں بھی مبتلا کر دیتا ہے، ولیم ہیزلٹ نے اپنے ایک نہایت مشہور مقالہ موسومہ "علما کی جہالت" میں ان خطرات کو واضح طور پر بیان کیا ہے لکھتا ہے کہ:-

"غیر معمولی تبحر علمی ایک ایسا خطرہ ہے جس میں بہت سے علما گرفتار ہیں۔ ان کی نظر کوتاہ ہوتی ہے اور فکر دور رس نہیں ہوتی ان کی دلچسپیوں کا حلقہ بہت محدود ہو جاتا ہے اور ان کی حالت اتنی ہی قابل رحم ہوتی ہے جتنا

کسی کارخانہ کے اس کاریگر کی جس کو صرف آلپنوں کے سروں کے بنانے کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے اول تو پنوں کا بنانا ہی خود کوئی عقل کو بڑھانے والا کام نہیں ہے اس پر طرہ یہ کہ اس کو چھوٹے سے کام میں سے بھی بہت چھوٹا سا حصہ انجام دینا پڑتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کاریگر اپنی ساری زندگی اپنے کام میں صرف کر دیتا ہے جو ذہنی سکون پیدا نہیں کر سکتا۔ یہ نام نہاد علماء صرف الفاظ کے غلام بن جاتے ہیں اور قدرت کے مشاہدہ کے لئے ان کے پاس بینائی باقی نہیں رہتی وہ اشیاء کا ادراک دوسرے اشیاء کے ذریعہ سے کرتے ہیں انکی کتابیں انکے اور اشیاء کائنات کے درمیان حجاب بن جاتی ہیں۔ کتابی کیڑا ایک قسم کی تن آسانی اور بے حس زندگی کا عادی ہو جاتا ہے۔ وہ ایک گرامو فون ہے جو صرف دوسروں کی کہی ہوئی باتوں کو چالاکی سے دہراتا رہتا ہے۔ ایسے لوگ دوسروں کی آنکھوں سے دیکھنے ان کے کانوں سے سننے اور ان کے اعتقادات پر اپنے عقاید کی بنیاد رکھنے کے شایق ہوتے ہیں۔ انھیں ناموں اور تاریخوں کا علم ضرور حاصل ہوتا ہے لیکن انسان اور اشیاء عالم کا علم بالکل نہیں ہوتا وہ ہندوؤں اور قلماقی تاتاریوں کے ذات پات کا مطالعہ تو نہایت شغف کے ساتھ کرتا ہے، لیکن اپنے ہمسایہ کے حالات سے بے خبر ہوتا ہے۔ وہ قسطنطنیہ اور پیکن کے طول و عرض سے بخوبی واقف ہے، لیکن اپنے پڑوس کی گلیوں کی اسے خبر نہیں ہوتی وہ خود اپنے احباب کے حالات سے آگاہ نہیں ہوتا، لیکن تاریخ کے مخصوص افراد پر

کتب بینی کے خطرات کا ذکر صرف مقالہ نگاروں ہی نے نہیں کیا ہے بلکہ بعض افسانہ نویسوں اور ناول نگاروں نے بھی اس پر روشنی ڈالی ہے، چیخوف نے اپنے افسانہ "معلم الادبیات" میں ایک معلم کی کردار نگاری کی ہے، یہ بیچارہ جغرافیہ کا معلم تھا اس کو اپنے مخصوص مضمون میں اسقدر انہماک تھا کہ اور تمام چیزوں سے دلچسپی ختم ہو گئی تھی اسکا ایک رفیق عشق میں مبتلا ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ اپنے دوست کو داستان دل سنائے لیکن اسے ہمت نہیں ہوتی۔ اس معلم نے کائنات کو صرف دو چیزوں میں محدود کر دیا تھا تاریخ اور نقشے۔ زندگی کے معاملات میں اسکی حیثیت ایک احمق سے زیادہ نہ تھی، وہ بالعموم خاموش رہتا اور جب کبھی گفتگو کرتا بھی تو نہایت خشک اور عامیانہ۔

اناطول فرانس نے بھی ان علما کا دبی زبان سے مضحکہ اڑایا ہے اور ان لوگوں پر طنز کیا ہے جو بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھتے ہیں۔ اس نے اس سلسلہ میں ایک کہانی بیان کی ہے کہ ایک شاہزادہ عجم کے تخت پر متمکن ہوا تو اس نے تمام علماء کو بلایا اور ان سے فرمایش کی کہ وہ بہت جلد ایک ایسی تاریخ عالم مرتب کر دیں جو سلطنت کے انتظام میں اسکے لئے مفید ہو۔ علماء اور عقلا بیس سال گزرنے پر بارہ اونٹوں کے قافلہ کے ساتھ دربار میں پہونچے، وزیر نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ علماء سلطنت تاریخ کی چھ ہزار جلدیں مرتب کر کے لائے ہیں اور اس عظیم الشان تاریخ کا صرف دیباچہ پانچسو جلدوں پر مشتمل ہے، بادشاہ نے وزیر سے کہا یہ تصنیفات حکومت کے حافظ خانے میں محفوظ رکھدی جائیں اور علماء سے

کہا جائے کہ وہ اتنی مختصر کتاب لکھیں کہ اس تھوڑے سے وقت میں جو میرے پاس ہے میں اس کو پڑھ سکوں۔ علماء بیس سال کے بعد پھر آئے اور اس مرتبہ وہ صرف ۱۵۰۰ جلدیں لائے۔ بادشاہ نے کہا میرے پاس ان کے پڑھنے کا بھی وقت نہیں ہے کیونکہ اب میں ضعیف ہو چکا ہوں۔ انھیں اور مختصر کیا جائے، علماء دس سال بعد پھر واپس آئے اور پانچسو جلدیں اپنے ہمراہ لائے لیکن بادشاہ نے پھر وہی جواب دیا کہ اس کے پاس پانچسو جلدیں پڑھنے کا بھی وقت نہیں ہے علماء پھر واپس چلے گئے اور پانچ سال کے بعد ایک جلد لیکر آئے لیکن اسوقت بادشاہ بستر مرگ پر پڑا تھا۔ اس افسانہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابیں لکھنے کا کام کسقدر تضیع اوقات ہے اور ان کا مطالعہ بھی کس قدر دشوار ہے ایک آدمی بغیر زیادہ پڑھے ہوئے بھی حقیقی و ضروری عقل حاصل کر سکتا ہے۔

ابھی تک تو میں گویا شیطان کی نیابت کر رہا تھا اور کتاب بینی کے خطروں کی تفصیل پیش کر رہا تھا اور ایسا کرنا ضروری بھی تھا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ کتب بینوں کو ان گڑھوں اور گھاٹیوں سے آگاہ کر دوں جو مطالعۂ کتب کے دوران میں سامنے آتے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دنیا بڑی حد تک کتابوں کی رہین منت ہے اور بہت سے لوگوں کی زندگی اس سے سدھر گئی ہے۔

اسٹیونسن کو افسانہ میں رشد و ہدایت کا سرچشمہ نظر آتا ہے اور اسی لئے وہ (Three Musketeers اور Pilgrims Progress) کا بڑا مداح ہے۔ اس نے شیکسپیر کے ڈراموں سے بھی کافی فایدہ اٹھایا۔ گیٹے کی سوانح میں اسے روحانی غذا ملی۔

ارباب عمل نے بھی کتابوں کے مطالعہ کو بہت مفید بتایا ہے، لارڈ کرزن کا عقیدہ تھا کہ کتب بینی بہترین تفریح ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "جب میں معتمد امور خارجہ تھا تو سخت تھکا دینے والے کام کے بعد تفریح کی سب سے بہتر صورت میں نے یہ نکالی تھی کہ اپنے قصیاتی کتب خانہ میں پہونچ جاتا۔ ارل آف بالڈون نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ وہ کلاسیکی ادب کا بہت منت پذیر ہے اس کے خیال میں ہومر، اور ورجل کا مطالعہ اخلاقی حیثیت سے بھی ارفع و اعلیٰ ہے۔

بعض اوقات کتابوں نے لوگوں کو نیا عزم و استقلال بخشدیا ہے اور زندگی کے دھارے کا رخ بدل دیا ہے جان اسٹورٹ مل نے اپنی خود نوشت سوانح میں لکھا ہے کہ ایک بار میں زندگی میں سخت مایوس ہو گیا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز باطل ہے۔ اتفاق سے مجھے ورڈس ورتھ کی نظموں کا ایک نسخہ ہاتھ آگیا میں نے اسے بغور پڑھا تو خوشی محسوس کرنے کی صلاحیت پھر عود کر آئی اور ایک کامیاب زندگی بسر کرنے کا ولولہ میرے اندر پیدا ہو گیا۔

جس طرح ورڈس ورتھ کی نظموں نے مل کو ایک نئی شاہراہ زندگی پر لگا دیا اسی طرح رسکن اور ٹالسٹائے کی چند کتابوں نے مہاتما گاندھی کی زندگی کا رنگ ہی بالکل بدل دیا وہ کہتے ہیں کہ "ٹالسٹائے کی کتاب "ایشور کا راج

خود تمہارے اندر ہے" نے مجھے مبہوت و مسحور بنا دیا اور اس کی آزاد خیالی، عمیق مذہبیت اور صداقت کے سامنے تمام دوسری کتابیں پھیکی نظر آنے لگیں۔"

مسولینی کو کبھی یہ حیثیت نہ حاصل ہوتی اگر کارل اور نیٹشے کا مطالعہ اس نے نہ کیا ہوتا، لینن کو سماج کی تعمیر جدید کا شوق کارل مارکس کے مطالعہ سے پیدا ہوا۔ الغرض مطالعۂ کتب کے فایدہ سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن یہ حقیقت ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ اپنی تعلیم آپ، ہر اس تعلیم سے بہتر ہے جو دنیا کی کسی یونیورسٹی میں دیجاتی ہے۔ اس سے یہ مقصد ہرگز نہیں کہ جو تعلیم اسکولوں یا یونیورسٹیوں میں دیجاتی ہے وہ لغو ہے بلکہ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اپنا پسند کیا ہوا طریقہ تعلیم بدرجہا بہتر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسی تعلیم کے لئے نصاب کیا ہونا چاہئے۔ میں اس سلسلہ میں کتابوں کے نام نہیں گنواؤں گا بلکہ اصولاً صرف یہ ظاہر کروں گا کہ اگر انسان کو صحیح معنی میں انسانی زندگی بسر کرنا ہے تو اسکو دنیا کی مختلف قوتوں کے سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے، اس کے لئے تھوڑی سی تاریخ پڑھنا ضروری ہے مگر صرف اپنے ہی ملک کی نہیں بلکہ سارے عالم کی۔ اسی کے ساتھ ان جلیل القدر لوگوں کے سوانح حیات پڑھنا چاہئے جنھوں نے دنیا میں ذہنی انقلابات پیدا کئے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ تاریخی ناول بھی پڑھنا چاہئے جو ماضی کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کر دینے والے ہیں اور فلسفہ کے مطالعہ کی بھی کوشش کرنا چاہئے خاصکر نفسیات اور اخلاقیات کا مطالعہ کہ یہ سائنس کے مطالعہ کا بھی ذوق پیدا کریگا ساتھ ہی ساتھ عمرانیات، اجتماعیات اور سیاسیات کا مطالعہ بھی کرنا چاہئے۔ اس طرز کے مطالعہ کے لئے کتابیں گنانا بے سود ہے پڑھنے والے کو خود اپنے مقاصد کا صحیح اندازہ کرنا چاہئے کہ نقادوں نے کتابوں کی تین قسمیں کی ہیں، معلوماتی کتابیں، تفریحی کتابیں اور الہام بخش کتابیں اور ان سب کا مطالعہ ضروری ہے۔

پروفیسر دیوان چند شرما — سید محمد عبدالعلیم ہاشمی

نگار کے پرانے پرچے

نگار کے مندرجۂ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کر لیں قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:۔

(۱۹۲۶ء) جنوری ۵ر۔ (۱۹۲۷ء) اپریل ۴ر۔ (۱۹۳۰ء) مئی ۴ر۔ (۱۹۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۲ء) فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل و اکتوبر) ۴ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۳ء) فروری و جولائی ۴ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۴ء) فروری و اکتوبر ۴ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۵ء) فروری، اپریل تا اگست، اکتوبر تا دسمبر ۵ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۶ء) فروری، مارچ، اپریل، مئی، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۵ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۷ء) مارچ اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، نومبر ۸ر فی پرچہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

مخلص نواز، آپ نے غالب کا یہ شعر سنا ہوگا :-

من آں نیم کہ دگر می تواں فریفت مرا
فریبش کہ مگر می تواں فریفت مرا

مدعا یہ کہ آپ نے میری سادگی کا یقین کیوں کر لیا۔ مانا کہ راوی کوئی اور نہ تھا خود میں ہی تھا، لیکن یہ تو دیکھئے کہ روایت کس سے بیان کی گئی تھی۔ اُس سے کہ جس نے آج تک سچی بات کا کبھی یقین ہی نہیں کیا۔ پھر یہ سب کچھ جانتے ہوئے آپ کا یہ سمجھ لینا کہ میرا شمار بھی اُن لوگوں میں ہے

جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

کہاں تک درست ہو سکتا ہے

میرے نزدیک ہر وہ بات جسے ضمیر انسانی گوارا کر سکے، صداقت سے باہر نہیں ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ میری صداقت آپ کا کذب ہو اور میرا کذب آپ کی صداقت۔ اس باب میں فلسفہ و منطق سے کام لیکر کوئی خاص نظریہ پیش کرنا لایعنی سی بات ہے۔ رہا سوسائٹی کا سوال، سو آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں جتنے "اجتماعی" جھوٹ بولے گئے ہیں، اتنے انفرادی جھوٹ نہیں بولے گئے

مذاہب عالم کے نظریوں کو دیکھئے، تاریخی "حقایق" کی چھان بین کیجئے، اس کی مثالیں بہ کثرت مل جائیں گی

میں آپ سے زیادہ عقلمند ہونے کا مدعی نہیں ہوں، لیکن اتنا احمق بھی نہیں کہ آپ کی "فکرِ بیدار" کی داد نہ دے سکوں۔ آپ نے جو کچھ کیا، اسے آپ کا جی خوش کرنے کے لئے کہئے تو "خوب" کہہ دوں، ورنہ سچ پوچھئے تو میں آپ کی ذہانت و فراست سے بہت فروتر سمجھتا ہوں

اللہ، اللہ، یہ زہرہ گدازیاں! یہ حوصلہ فرسائیاں! — میں تو عتاب نامہ دیکھ کر کانپ اُٹھا کہ کہیں یہ نزلہ اس عضوِ ضعیف پر تو گرنے والا نہیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میرے ساتھ قدرت کا معاملہ اسوقت تک کیا رہا ہے

ہر چہ از گریہ فشاندیم بہ نشتر دن ریخت
ہر چہ از نالہ رساندیم بہ نشنودن رفت

کلیجہ پتھر کا ہو گیا ہے اب نہ "غمزۂ نا ہیدہ" کا اثر ہوتا ہے نہ "قہر مریخ" کا۔ آنکھ، زبان خشک ہیں اور دل برف کی قاش۔ پھر آپ کہ ابھی تک "خیالِ طرۂ لیلیٰ" لئے بیٹھے ہیں، اس شخص کا قدم کیوں درمیان لاتے ہیں جو ماوراء دنیائے "محمل و منزل" زندگی بسر کر رہا ہے۔

آپ کے اس زعم و پندار کا جواب میرے پاس صرف یہ ہے کہ:—

"غبارے سطرِ آشفتگی بر ہوا نگاشت پنداشت مصنفِ کتاب آسمانم،
پرکاہے، بنیادِ فطرت بر باد گزاشت، ذانست نمشیِ طومارِ کہکشانم"

لاحول ولا قوۃ، آپ بھی عجیب چیز ہیں۔ میں کہ

بر سرم ز آزادی سایہ را گرانیہاست

ان کو اپنے پاس رکھ کر ساری دنیا کی ذمہ داریاں اپنے سر لیلوں! میری حماقت پر آپ کو اتنا بر دست اعتماد ہے یہ خبر مجھے نہ تھی!

مردانگی کا راز صرف راز دارانہ زندگی بسر کر جانا ہے۔ یعنی باوجود احساس و تاثر کے دوسروں کے سامنے بیخبر انہ رہنا۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب دُنیا کے ساتھ کم سے کم امیدیں وابستہ ہوں، مایوسی کے مقابلہ کے لئے زیادہ سے زیادہ تاب مقاومت پیدا کی جائے

مردہ ہے جو گھر میں فاقہ کرتا ہے لیکن باہر نکلتا ہے تو اس کی مونچھوں پر بل ہوتا ہے اور پیشانی پر جلال۔ لیکن یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہے جب سوال صرف اپنی ذات کا ہو۔ دوسروں کی ذمہ داریاں اپنے سر آئیں اور زمانہ نے نیچا دکھایا

دوسروں کے لئے تکلیف اُٹھانا اس میں شک نہیں بڑی چیز ہے، لیکن انسانی وقار کو کھو کر یہ چیز حاصل کرنا کم از کم میرے بس کی بات نہیں

آپ خفا تو ہوں گے، لیکن آج آپ کی برہمی برداشت کر لینا آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ کل آپ بھی مجھے

ذلیل سمجھنے لگیں - اس صورت کے علاوہ اور جو تدبیر آپ تجویز فرمائیں اس میں بقدرِ امکان حصہ لینے کے لئے طیار ہوں

یہ آپ کی "پرسشِ گاہ گاہ" بڑی تکلیف دہ چیز ہے۔ بمبئی کی اُس تحریر کے بعد جس کا جواب براہ راست آپ تک نہ پہونچ سکتا تھا، آپ نے بالکل خاموشی اختیار کر لی۔ میں متفکر تھا کہ آپ کی صحت کی خبر کیونکر معلوم کروں آپ کی وہ باتیں جو انسان کو پروانہ کی طرح "نیمۂ داغ و نیمۂ خاکستر" بنا دیتی ہیں، کس طرح سنوں، لیکن کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی، آخر کار مایوس ہو گیا۔ اب کئی مہینے کے بعد آپ نے پھر یاد فرمایا لیکن نہایت روا روی میں، جس طرح سرِ راہ کسی سے ملاقات ہو جائے۔ یہ کیا ادا ہے، میں آپ ہی پوچھتا ہوں

شکر ہے کہ آپ اب صحیح و توانا ہیں۔ میں بھی اچھا ہوں لیکن جس وقت یہ دیکھتا ہوں کہ:-

"موسمِ دیرِ غنودن بہ شبستاں آمد" اور اس کا کوئی سامان موجود نہیں تو پھر مضمحل ہو جاتا ہوں - کیا آپ نے کبھی داغ کے اس شعر پر غور کیا ہے:-

چمپا کھلا گلاب کھلا موتیا کھلی
دل کی کلی نہ تجھ سے مگر اے صبا کھلی

اس شعر میں مجھے صرف "تجھ سے" کی تفسیر آپ سے پوچھنا ہے - لیکن نتیجہ معلوم!

پردہ ڈالا ہے وہ تو نے کہ اُٹھائے نہ بنے

خوش رہئے، اور کیا کہوں

قبلۂ دلِ مستمنداں،

تاخیرِ جواب پر شرمندہ ہوں، لیکن میں اس دوران میں ہرگز اس قابل نہ تھا کہ فرمانِ گرامی کی تعمیل کر سکتا اور یوں کوئی عریضہ پیش کرنا مناسب نہ تھا

میں نے سب سے پہلی فرصت میں ان کو بلا کر آپ کا پیغام پہونچایا اور وہ تمام صورتیں جو تکمیلِ مقصد کیلئے ضروری ہیں ان کو اچھی طرح سمجھا دیں۔ وہ پہلے ہی سے مطمئن تھے، لیکن اب تو انھیں بالکل یقین ہے اور مجھے امید ہے کہ جناب کی خواہش کے مطابق تمام مراحل طے پا جائیں گے

میں ضرور آیندہ دسمبر میں حاضری کی کوشش کروں گا۔ اس سے زیادہ سعادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ چند ساعتیں آپ کی صحبت میں گزر جائیں

صدیقی ، میں سمجھتا تھا کہ آپ کی رنگین مزاجیاں ضرور کوئی نہ کوئی گل کھلائیں گی، لیکن یہ بات میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ یہ دولت اتنی مستعجل ثابت ہوگی - آپ نے تو نہیں لکھا، لیکن مجھے کسی طرح معلوم ہو ہی گیا کہ قصور آپ کا نہ تھا بلکہ اُن کا تھا - بہرحال یہ بحث فضول ہے کہ جو کچھ ہوا وہ کیونکر ہوا، اب سوچنا یہ ہے کہ آئندہ کیا ہوگا - میری رائے اب بھی وہی ہے جو پہلے تھی، حیرت ہے کہ عنقا کے آپ قایل نہیں، کیمیا پر آپ کا اعتقاد نہیں، لیکن اُن سے وفا کی امید ضرور رکھتے ہیں

اخلاق کی تباہی بھی کم افسوسناک نہیں، لیکن جب اس کے ساتھ عزت و دولت بھی شامل ہو جائے تو پھر "گریہ و ماتم" سے بھی کافی اظہار تاسف نہیں ہو سکتا - اگر دل گوارا کرے تو چند دن کے لئے کہیں چلے جایئے جب "لاحول" سے کام نہ چلے تو "ماحول" بدل دینا ضروری ہے .

مکرمی - آپ نے بالکل صحیح لکھا کہ مومن کا سمجھنا آسان نہیں - میں تو یہ کہتا ہوں کہ اس کا پڑھنا بھی آسان نہیں - اس کے اشعار کا لب و لہجہ خاص ہوتا ہے اور جب تک اسی انداز سے ان کو نہ پڑھا جائے مفہوم پیدا نہیں ہوتا - ان کا مشہور شعر ہے :-

ان سے پری وش کو نہ دیکھے کوئی
مجھ کو مری شرم نے رسوا کیا

پہلے مصرعہ کو معمولی لہجہ میں پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ مومن لوگوں کو منع کر رہا ہے کہ اُس کی پری وش کو کوئی نہ دیکھے حیرت و استعجاب کے لہجہ میں پڑھیں تو مفہوم واضح ہو جائے گا یعنی میں نے تو اس کی طرف اس لئے نہ دیکھا تھا کہ رازِ محبت ظاہر نہ ہو، لیکن میری یہ احتیاط ہی رسوائی کا باعث ہو گئی کیونکہ ایسے پری وش کو نہ دیکھنا کیا معنی -

غالب کے ہاں نازک خیالی کی کمی نہیں لیکن تغزل سے کبھی کبھی ہٹ جاتا ہے - یہاں تک کہ جب وہ اس سے ہٹ کر فلسفہ طرازی سے کام لیتا ہے تو بالکل چوبِ خشک ہو جاتا ہے، لیکن مومن کا لوچ وہی رہتا ہے - زندگی اور غم دونوں کا لازم ملزوم ہونا غالب نے اس طرح بیان کیا ہے :-

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

بالکل حدیقۂ حکیم سنائی یا پند نامہ عطار کی چیز معلوم ہوتی ہے - لیکن مومن اس خیال کو اس طرح ظاہر کرتا ہے :-

چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی
ناصح یہ بندِ غم نہیں، قیدِ حیات ہے

مفہوم و طرزِ ادا دونوں میں غالب سے بڑھ گیا

مگر شاعرانہ میں تو خیر مومن کا کوئی ہمسر پیدا ہی نہیں ہوا۔ یہ رنگ اسی کی ایجاد تھا اور اسی پر ختم ہو گیا۔ غالب کے یہاں بھی اس کی بعض مثالیں مل جاتی ہیں، لیکن مومن کے تیور کچھ اور ہی ہیں۔ غالب کا مشہور شعر ہے:۔

بہر اہول ہیں تو چاہئے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

یہ مکرِ شاعرانہ ہے، لیکن مومن نے اس سلسلہ میں عجیب شاعرانہ نزاکتیں پیدا کی ہیں، کہتا ہے:۔

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا — جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

مومن چاہتے ہیں کہ معشوق دشمن کی طرف نہ دیکھا کرے، لیکن ظاہر ہے کہ وہ کیوں ماننے لگا اس لئے مومن نے یہ بہانہ پیدا کیا۔ اسی رنگ کے دو شعر اور سنئے:۔

خواہش مرگ ہو اتنا نہ ستانا ورنہ — دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا

دربان کو آنے دینے پہ میرے نہ کیجئے قتل — ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا

مومن کی حقیقی شاعری کا جوہر ظنزیات میں کھلتا ہے، یا پھر جلی کٹی میں

ظنزیات کے بعض شعر ملاحظہ ہوں:۔

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے — تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

رشک دشمن بہانہ تھا، سچ ہے — میں نے ہی تم سے بیوفائی کی

دوسرے رنگ کے لئے اس کی چھوٹی زمینیں دیکھئے:۔

اب اور سے لو لگائیں گے ہم — جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

سر دوشِ عدو پہ رکھ کے بیٹھے — جانا نہ کہ سر اٹھائیں گے ہم

گر تیری طرف کو بیقراری — کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم

بتخانہ چیں ہو گو ترا گھر — مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

مطلوب ہیں

نگار جنوری ۲۷ء۔ نومبر ۳۳ء۔ جنوری و اپریل تا ستمبر۔ نومبر و دسمبر ۳۴ء۔ جون ۳۵ء۔ مئی و اگست ۳۶ء فروری۔ دسمبر ۳۷ء کے نگار کے پرچے جو صاحب علٰحدہ کرنا چاہیں، دفتر کو اطلاع دیں۔

منیجر نگار لکھنؤ

سیاسیات یوروپ

(۱۰)

انگلستان

برطانیہ کا نظام حکومت اسقدر عجیب و غریب ہے کہ نہ اس کی کوئی دوسری مثال تاریخ میں ملتی ہے، نہ اسکی نوعیت کے لحاظ سے اس کا کوئی خاص نام رکھا جا سکتا ہے، وہ بیک وقت ملوکیت بھی ہے، حکومت اعیان (Oligarchy) بھی اور آزاد ڈیماکریسی بھی۔ اس کو سمجھنے کے لئے وہاں کی تقسیم دولت پر ایک نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔

انگلستان میں صاحب ملکیت جماعت صرف دو فی صدی ہے لیکن قومی دولت کا ۶۴ فی صدی حصہ انکے پاس ہے، یہی جماعت فی الحقیقت یہاں کی حکمراں جماعت ہے، جو دنیا کے تمام بازاروں پر قابض ہے اور دارالعوام و دارالخواص کو اپنا کلب جانتی ہے۔

ان کی حکومت کی بنیاد تین قوتوں پر قایم ہے، بحری اقتدار، بینک آف انگلینڈ اور سول سروس۔ اور قومی آمدنی کے بڑے حصہ پر انھیں کو اختیار حاصل ہے۔ وہاں کی غیر متوازن تقسیم دولت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ولیسٹ اینڈ کا صرف ایک امیر ۲۷۰ ایکڑ زمین کا مالک ہے۔

لندن کی ۸۰ لاکھ آبادی میں صرف ۴۰ لاکھ افراد ایسے ہیں جو صاحب ملکیت ہیں اور ان میں بھی صرف ۲۰ ایسے ہیں جو واقعی قیمتی زمین کے مالک ہیں۔ انگلستان میں ایک لاکھ مرد عورت ایسے ہیں جن کی آمدنی دو ہزار پونڈ سالانہ سے زیادہ ہے اور قومی دولت ۱۶ فی صدی ان کے قبضہ میں ہے اور ایک کرور اسی لاکھ ایسے ہیں جن کی آمدنی ۲۵۰ پونڈ سالانہ سے کم ہے اور ۵۶ فی صدی قومی دولت ان کے قبضہ میں ہے۔ انگلستان میں جو لوگ مرتے ہیں انمیں صرف چوتھائی ایسے ہوتے ہیں جو سو پونڈ کی ملکیت اپنے بعد چھوڑ جاتے ہوں۔

دارالعوام میں سرمایہ داری کی بڑی زبردست مرکزیت پائی جاتی ہے۔ ۱۹۳۴ء میں دارالعوام کے ۶۱۰ ممبر ۶۵۰ کمپنیوں کے ڈائرکٹر تھے اور ایک ممبر پارلیمنٹ تو ۳۴ کمپنیوں کا ڈائرکٹر تھا۔ دارالامراء (ہاؤس آف لارڈز) میں ۷۲۹ امراء ہیں جن میں ۲۴۶ بڑے زمیندار ہیں، ۱۱۲، بیمہ کمپنیوں کے ڈائرکٹر ہیں، ۴۷، صرافہ کے کاروبار کے ڈائرکٹر ہیں، ۶۷، بنکوں کے ڈائرکٹر ہیں، ۴۷، ریلوے کمپنیوں کے اور ۴۹، جہاز بنانے والی کمپنیوں کے۔ اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ بجملہ ۷۲۹ امراء کے نصف سے زیادہ ایسے ہیں، جنھوں نے ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۱ء تک کسی مباحثہ میں حصہ نہیں لیا اور ۱۱۱ نے کسی اخلاقی مسئلہ میں کوئی رائے نہیں دی۔ اسی طرح گویا اوسطاً صرف ۸۳ امراء نے کام میں حصہ لیا۔

انگریزی قوم ہر چند بہت سی قوموں کا مجموعہ ہے لیکن انگلستان کی جائے وقوع اور اس کی جغرافی خصوصیت نے سب کا نقطۂ نظر ایک ہی کر دیا ہے۔ ایک جزیرہ کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے ان میں بہت پیش بینی پیدا ہو گئی ہے اور وطنیت کا جذبہ قوی ہو گیا ہے۔

انگلستان اپنی پیداوار کے لحاظ سے زیادہ خوش قسمت نہیں ہے، وہ اپنی غذائی ضرورتوں کا صرف ⅔ حصہ پیدا کر سکتا ہے اور خام پیداوار جس پر اسکی صنعت و حرفت قایم ہے وہاں صرف ۲۰ فی صدی ہوتی ہے۔ لوہا، کوئلہ، اور فولاد البتہ وہاں بہت کافی پیدا ہوتا ہے، اسی لئے وہ یورپ بھر میں سب سے بڑا صنعتی ملک مانا جاتا ہے اور اس کی تجارت ۴۰ فی صدی برآمد کی تجارت ہے۔

وہاں کی حکمراں جماعت سب کی سب تجارت کرتی ہے اور اسی سے دولت کماتی ہے۔ انگریزی قوم تجارت کا اتنا زبردست احساس رکھتی ہے کہ کمائی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ یہاں تک کہ شاہی جواہرات سے بھی کچھ نہ کچھ فایدہ اٹھا لیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ اُن کے دیکھنے کے لئے بھی چھ پنس ادا کرنے پڑتے ہیں مشہور ہے کہ ایک انگریز نے ہفتہ میں چھ دن بنک انگلستان کی پوجا کرتا ہے اور صرف ایک دن گرجا کی اور یہ بھی اس لئے کہ وہاں مذہب کی قوت بڑی حد تک ہنوز باقی ہے۔

وہاں آزادی کا احساس بھی بڑا قوی ہے اور آزادی حاصل کرنے کے لئے انھوں نے فرانسیسیوں کی طرح بڑی قیمت ادا کی ہے، یہاں تک کہ متعدد بادشاہوں کی گردنیں محض آزادی کے لئے کاٹ ڈالی گئیں۔

وسٹ منسٹر کا پارلیمنٹری نظام اتنا عجیب و غریب ہے کہ ہر قوم اس پر رشک کرتی ہے اور بجا رشک کرتی ہے، ڈکٹیٹرشپ میں شخص واحد خادم قوم کی حیثیت رکھتا ہے اور ڈماکریٹک حکومتوں میں حکومت، افراد کی خدمت کرتی ہے، اس حقیقت کو کوئی انگریز کبھی نہیں بھولتا اور ایک کھیل کی طرح اس پر عامل ہے۔ جسوقت انتخاب کی منزل ختم ہو جاتی ہے تو دونوں مخالف اس طرح ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہیں، گویا یہ کوئی ٹینس کا کھیل تھا۔ جب مسٹر بالڈون پہلی مرتبہ وزیر اعظم ہوئے تو سب سے پہلے انھوں نے لارڈ آکسفورڈ ہی سے مشورہ طلب کیا جو انتخاب میں ان کے نہایت شدید

مخالف فریق تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ انگریز قوم انگلستان کے مسئلہ کو جماعتی سیاسیات سے بالکل علیحدہ ہو کر دیکھتی ہے۔ جس وقت لارڈ کرزن کا انتقال ہوا (جو سخت ٹوری تھا) تو لیبر پارٹی کے ممبروں نے دارالعوام میں اس کی بہت تعریف کی۔ ۱۹۲۶ء میں جب ویلس کے اندر عام اسٹرائیک ہوا ہے تو پولیس اور اسٹرائیک کرنے والے دونوں فٹ بال ساتھ ساتھ کھیلتے تھے۔

حکومت و وطن کے ساتھ وفاداری وہاں بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے آدمی میں پائی جاتی ہے۔ باہر کے لوگ جو وہاں جاتے ہیں انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ ملک انقلاب سے کیونکر بچا ہوا ہے جہاں اتنی غیر متوازن تقسیم دولت کی پائی جاتی ہے اس وقت انگلستان میں ۲۰ لاکھ آدمی بیکار ہیں جن میں نصف ایسے ہیں جو کسی کام کے قابل نہیں ہیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ جب رائے دینے کا وقت آتا ہے تو ان بیکار غریبوں کی جماعت کنسرویٹو ممبر ہی کے حق میں رائے دیتی ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ متوسط طبقہ لیبر جماعت کی اہلیت کی طرف سے مطمئن نہیں ہو اور دوسرے یہ کہ حکومت ان فاقہ کش غریبوں پر ۲۰ لاکھ پونڈ ہر ہفتہ صرف کر کے اُن میں بے چینی پیدا نہیں ہونے دیتی۔

حکمراں جماعت کے دست و بازو وہاں کئی ہیں۔ ایک تو بحری طاقت ہے جو بجائے خود ایک قانون کی حیثیت رکھتی ہے، دوسرے بنک جو نہایت ہی عجیب و غریب ادارہ ہے اور تیسرے وہاں کے سرکاری مدارس۔ کابینہ کے ۵۵ ممبروں میں کم از کم سولہ تو ایٹن کے مشہور مدرسہ کے طالب علم ہوتے ہیں، چھ، ہیرو اسکول کے اور سترہ دوسرے مدارس کے۔ یہ لوگ اس کا بڑا لحاظ رکھتے ہیں کہ ان کا اسکول کسی طرح بدنام نہ ہو، چنانچہ مسٹر بالڈون نے لکھا ہے کہ جب ترتیب وزارت کی دعوت انھیں دی گئی تو انھوں نے پوری کوشش کی کہ مدرسہ ہیرو (جہاں وہ طالب علم تھے) بدنام نہ ہو۔

اخباروں کا بھی وہاں بہت اثر ہے اور اس لئے حکمراں جماعت ہمیشہ ان کو بھی زیر اقتدار رکھتی ہے، لیکن سول سروس کا نظام سب سے زیادہ عجیب و غریب ہے اور حقیقتاً یہی ریڑھ کی ہڈی سمجھی جاتی ہے۔

اس ملک کا طریق پروپاگنڈا بھی نہایت عجیب ہے۔ احتساب سے وہ بھی کام لیتے ہیں لیکن زیادہ تر جاسوسی کے ذریعہ سے۔ حبشہ کی جنگ کے وقت بحر روم میں برطانوی بیڑہ کی قوت سے ہر اخبار واقف تھا، لیکن مخالف جماعت کے اخباروں نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ انتخاب کے وقت وہاں اتنا سخت ناجائز سیاسی دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ اگر یہی صورت ترکی یا بلغاریہ میں پیش آئے تو آزاد خیال اخباروں میں ہلچل پڑ جائے۔

برطانیہ کی خارجہ پالیسی جو نسلاً بعد نسلٍ ایک ہی سی چلی آرہی ہے، صرف یہ ہے کہ مغربی سلطنتوں کی قوت متوازن رہے اور توازن کا قیام انگلستان کے ہاتھ میں ہو۔

سر آسٹن چیمبرلین نے ایک بار ظاہر کیا تھا کہ "ہماری بڑی بڑی لڑائیاں صرف اس لئے لڑی گئی تھیں کہ کسی

ایک حکومت کا اقتدار دوسری مغربی حکومتوں پر قایم نہ ہوجائے"۔ ٹریولیان کا بیان ہے کہ "ٹیوڈروں کے زمانہ سے اسوقت تک انگلستان نے سیاسیات یوروپ سے صرف یہ کام لیا کہ وہ خود حملوں سے محفوظ رہے اور جو تدبیریں سمندر پار کے ممالک کے قبضہ کے لئے اختیار کی جاتی ہیں وہ پٹ نہ پڑیں"۔

اسی پالیسی کے تحت انگلستان کا موجودہ طرزِ عمل یہ ہے کہ اگر فرانس کسی وقت جرمنی سے زیادہ مضبوط ہوجانے تو جرمنی کی مدد کرے اور اگر کبھی جرمنی فرانس سے بڑھ جائے تو فرانس کی مدد کرے۔ چنانچہ جنگ عظیم کے بعد سے لیگ اقوام اسی پالیسی کی تکمیل کا ذریعہ بنی ہوئی ہے اور اگر کسی وقت لیگ اس مقصد کی تکمیل میں ناکام ہوئی تو برطانیہ اس کو ختم کردے گا لیکن چونکہ برطانیہ نے اپنے دیگر مقبوضات (ہندوستان وغیرہ) کو بھی اس میں علٰحدہ مستقل حکومتوں کی طرح شامل کرلیا ہے اس لئے لیگ پر ہمیشہ انگلستان کا اقتدار قایم رہیگا۔

جنگ سے قبل برطانیہ کی پالیسی یہ نہ تھی کہ وہ یوروپ کے آیندہ امکانی خطرات کو پیش نظر رکھکر، اپنی قوم کو کسی مخصوص طرزِ عمل پر مجبور کرے، لیکن اب انگلستان یوروپ کے آیندہ خطرات کا پہلے ہی سے بندوبست چاہتا ہے تاکہ امن وسکون کی تباہی سے اس کی تجارت متاثر نہ ہو۔ تاہم انگلستان اپنی خارجہ پالیسی کو بالکل کھیل ہی سمجھتا ہے، اہل جرمن و فرانس کے لئے تو سیاسیات موت وزندگی کی چیز ہے، لیکن انگلستان سمجھتا ہے کہ یوروپ ایک اسٹیج ہے جس پر ایکڑ اپنا کام کرتے ہیں اور اگر کسی ایکٹر سے کوئی غلطی ہوجائے تو سمجھ لیا جائے کہ یہ صرف اس کی غلطی تھی اور دوبارہ کوشش کرکے اس غلطی کو دور کرنا چاہئے۔

انگلستان کے دفتر خارجہ میں دو گروہ ہیں۔ ایک وہ جو لیگ اقوام کا طرفدار ہے اور یوروپ میں قیام امن و سکون کے خیال سے ایک متحدہ ذمہ داری پیدا کرنے کے لئے جرمنی کو بھی دول عظمٰی کی صف میں شامل کرنا چاہتا ہے یہ گروہ لڑائی کے نام سے کانپ اٹھتا ہے اور حبشہ کی جنگ کو اس نے اخلاقی قانون کی خلاف ورزی سمجھا۔ دوسرا گروہ جس میں ذرا معمر آدمی شامل ہیں، وہ ان تمام جھگڑوں سے علٰحدہ ہوکر صرف یہ چاہتا ہے کہ بحری قوت کو بڑھایا جائے اور خواہ مخواہ دوسروں کے معاملات میں دخل نہ دیا جائے۔ چنانچہ اس جماعت کی یہی پالیسی تھی جس نے جرمنی کو اتنے ہاتھ پاؤں پھیلانے کا موقعہ دیا۔

اس میں شک نہیں کہ ہٹلر کی آمریت کے بعد بھی انگلستان میں جرمنی کی طرفداری کا جذبہ بہت قوی پایا جاتا ہے۔ اور اس کے متعدد اسباب ہیں۔

۱۔ انگلستان کی ٹوری جماعت، بالشیوزم سے بہت خایف ہے اور اپنی حماقت سے اس نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہٹلر اس امر کی گارنٹی ہے کہ یہ تحریک مغرب کی طرف نہ بڑھے گی۔ اس لئے انگلستان اور جرمنی کو متحد رہنا چاہئے۔

۲۔ انگلستان اور خصوصیت کے ساتھ لندن والوں کا بہت سارو پیہ جرمن کاروبار میں لگا ہوا ہے، اسلئے اس سے

لڑائی مول لینا ایک بڑے سرمایہ کو خطرہ میں ڈالنا ہے۔

۳۔ انگلستان کے بہت سے صاحب اقتدار ایسے ہیں جو فرانس اور فرانسیسیوں سے نفرت کرتے ہیں اور اسلئے وہ قدرتاً جرمنی کی طرف مایل ہیں۔

۴۔ لارڈ لوتھین اور ان کے حواریین کا خیال ہے کہ یورپ میں امن وسکون صرف اسی طرح قایم رہسکتا ہے کہ جرمنی مضبوط رہے اور ہٹلر کا ساتھ دینا گویا جرمنی کو مضبوط بنانا ہے۔

۵۔ وہاں کے اخبارات ہر چند نازی تحریک کو پسند نہیں کرتے لیکن بالشیویت یا اشتراکیت کو اس سے بھی برا جانتے ہیں اور اس لئے وہ روس کے مقابلہ میں ہٹلر کی طرفداری کو پسند کرتے ہیں۔

۶۔ انگلستان میں عام میلان لوگوں کا یہی ہے کہ گو جرمن مغلوب دشمن ہے لیکن ہے قابل عزت۔

۷۔ لیبر پارٹی میں بھی جماعتیں جرمن کی طرفدار ہیں۔

اس لئے اگر کسی وقت جرمن کے خلاف یورپ میں جنگ چھڑی تو یہ تمام اثرات ضرور اپنا کام کرینگے اور چونکہ ہٹلر یہ سمجھتا ہے کہ انگلستان کا نیوٹرل رہنا ناممکن نہیں ہے اس لئے اس کی ہمتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔

جرمنی کے ساتھ انگلستان کی پالیسی کا رُخ ۳۵ء کے بحری معاہدہ سے ظاہر ہو جاتا ہے جس کی رو سے اگر جرمن اپنی فوجی طاقت بڑھا سکتا ہے تو دوسری طرف برطانیہ بھی اپنی ہوائی طاقت کو سہ چند کر سکتا ہے اور تجارت میں جرمن مسابقت کی طرف سے مطمئن ہو جاتا ہے۔

۱۹۱۴ء میں برطانیہ نے جرمنی کے خلاف محض فرانس یا بلجیم کی ہمدردی میں جنگ نہیں کی تھی، بلکہ سبب یہ تھا کہ دنیا کے بازاروں میں جرمنی نے انگلستان کو پیچھے ڈھکیل دیا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ انگلستان کی تجارتی کساد بازاری بڑھ گئی تھی اور بیکاروں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ اب یہی اندیشہ جاپان کی طرف سے پیدا ہو گیا ہے، لیکن انگلستان اس سے براہ راست جنگ نہیں کرنا چاہتا، اس لئے چاہتا ہے کہ جرمنی کو مضبوط کر دیا جائے تاکہ جاپان اس کے ساتھ ملکر روس پر حملہ کرے اور اس طرح آخر کار یہ تینوں قوتیں کمزور ہو جائیں۔

اس میں شک نہیں کہ انگلستان بڑی حد تک جرمن کا طرفدار ہے، لیکن وہ جرمن کے خلاف اپنے آپ کو پوری طرح مسلح کرنے سے بھی غافل نہیں ہے، کیونکہ اسے اگر کسی کی طرف سے اندیشہ ہے تو وہ جرمنی ہی ہے، اسلئے برطانیہ کی خارجہ پالیسی کا صحیح علم اسوقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس کے مسلح ہونے کا زبردست پروگرام پورا نہیں ہو جاتا اب تو وہاں بحری قوت بڑھائی جا رہی ہے، ہوائی طاقت پر بیدریغ دولت صرف ہو رہی ہے، ہلاکت بار آلاتِ حرب پر آنکھ بند کر کے روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے اور جب یہ سب کچھ ہو چکے گا تو معلوم ہو گا کہ انگلستان کا صحیح ارادہ کیا ہے اور وہ یورپ میں کس کو باقی رکھنا چاہتا ہے اور کس کو پامال کر دینا۔

آمرِ جرمنی کی داستانِ عشق

یورپ کی موجودہ فضائے سیاست جن روشن اور تابناک ستاروں سے مزین ہے اس میں جرمنی کے آمرِ اعظم اڈالف ہر ہٹلر کی ذات خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہے اس کی سیاسی فراست نے اس کے نام کو "روم برلن محور" سے ہمیشہ کے لئے وابستہ کر دیا ہے جس کے زور پر اس نے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈالکر رائن، اسٹریا اور زیڈ ٹینلینڈ کے ایک حصہ کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ یہ ہٹلر کی شدید خود اعتمادی کی دلیل ہے کہ اس نے لوکارنو اور ورسیلز کے عہد ناموں کو پس پشت ڈالکر برطانیہ اور فرانس کے ہاتھوں سے وہ اقتدار چھین لیا جس کے دینے کے لئے وہ خوشی سے آمادہ نہ تھے اس طرح ان دو جمہوری طاقتوں کا اثر زائل کرنے اور یوروپ کے توازنِ ملکی کے برباد کرنے میں ہٹلر نے بڑی مردی ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ اس نے یہ جو کچھ حاصل کیا وہ اخلاقی اصولوں کی قربانی کر کے حاصل کیا لیکن نازیت اور فسطائیت اخلاقی اصولوں سے یکسر مبرا ہیں، اُن کی کتابِ سیاست میں ایفائے وعدہ سے زیادہ عہد شکنی میں اخلاقی شان مضمر ہے، وہاں طریقۂ کار کے بجائے نتیجہ سے بحث ہوتی ہے اور آغاز سے زیادہ انجام پر زور دیا جاتا ہے یہ سب باتیں اپنی جگہ صحیح و درست سہی لیکن اس حقیقت سے بھی مشکل سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ ہٹلر نے جرمنی میں ایک حیات آفریں صور پھونک دیا ہے اس کے بچہ بچہ میں نئی روح اور نئی زندگی پیدا کر دی ہے۔ اب جرمنی ایک حقیقت ہے ایک صداقت ہے، اس کے معاشی و فوجی وسایل اور ذرایع بہت وسیع ہو گئے ہیں، اس کی ہوائی طاقت انگلستان و فرانس کی متحدہ طاقت سے کہیں زیادہ بہتر ہے اور یہ سب کچھ ایک شخص۔ یعنی ہر ہٹلر کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

ہٹلر اپنے عادات و خصائل کے لحاظ سے اتنا "سنگین" اور "آہنی" قسم کا انسان معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر اسکے اوپر خدنگِ عشق کا کوئی اثر ہو ہی نہیں سکتا اور ہمارے ذہن میں اس کے کسی سے محبت کرنے کا مفہوم آتا ہی نہیں، لیکن حسن و عشق کی دار و گیر عام ہے اور محبت کی جنوں زائیاں کسی خاص شخص، نوع، مقام اور وقت کے لئے مختص نہیں۔ محبت کے دیوتا نے "لوہے کے انسانوں" اور شاہانِ جم مرتبت سبھی کو جب چاہا ہے، نوازا ہے، درد محبت کی تقسیم میں خدائے عشق نے فقیر و امیر کی تخصیص قطعاً نہیں کی ہے، ہٹلر نے بھی نپولین کی طرح عشق

میں کافی شدت و التہاب کا ثبوت دیا ہے، اس کے بعض افسانہائے محبت اسی وجہ سے اپنے اندر کافی جاذبیت رکھتے ہیں، لیکن اس کی خاتمہ گی نے اس کے سپاہیانہ جذبات کو کبھی ماند نہیں ہونے دیا ہے۔

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں، معمولی لوگوں کے کانوں تک اُن کی بھنک بھی نہیں پہونچتی، ڈیوک آف ونڈسر سابق ایڈورڈ ہشتم کی محبت کا ذکر انگلستان کے اخبارات میں بہت کم آیا، امریکن اخبارات البتہ اسکے اوپر ہنگامہ مچاتے رہے لیکن یہ تمام قصہ انگلستان کی پبلک کے سامنے کماحقہ اُسوقت آیا جبکہ وہ اپنی تمام نیازمندیاں "ناز" کی خدمت میں پیش کر چکے تھے اور ایک ہستی کی خاطر تاج و تخت کو پائے استحقار سے ٹھکرا چکے تھے، آمرین یورپ کی "پس پردہ" زندگی کا بھی ہمیں بہت تھوڑا علم ہے خصوصاً جرمنی کے مقابلہ میں ہماری "بے علمی" بڑی قابلِ رحم ہے، ہمیں جو کچھ وہاں کے حالات معلوم ہوئے ہیں وہ یا تو اُن خبروں کے ذریعہ جو جرمنی سے تار کے ذریعہ دوسرے ملکوں میں بھیجی جاتی ہیں یا پھر ہٹلر کی سوانحعمری کے ذریعہ، یا اُن سیاحوں کے ذریعہ جو تفریح کے طور پر یا وہاں کے حالات کا مطالعہ کرنے کے لئے جاتے ہیں، یہ خبریں عام طور پر گپ اور پروپیگنڈے کی حیثیت رکھتی ہیں اور حقایق تک پہونچنے کے لئے بڑی چھان بین کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن کچھ نامہ نگاروں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ان آمرین یورپ کے اندرونی حالات کی نقاب کشائی کی ہے، ان لوگوں میں فرڈمان جو ایک امریکن ہے اور جسکی بیوی ہے وہ ایک عورت ہے اور وہ شہزادی کیتھرائن ریڈزی ول (Princess Catherine Radziwill) کے نام سے مشہور ہے اس نے جو کچھ معلومات حاصل کی ہے وہ جرمنی اور آسٹریا کی اُن عورتوں سے حاصل کی ہے جو وہاں کی سوسائٹی میں بڑی مقتدر اور با اثر ہیں۔

ہٹلر کی سوانح عمری (Mein Kemp) عورتوں کے ذکر سے یکسر خالی ہے اس میں گویا عورتوں کے وجود ہی کو قطعاً تسلیم نہیں کیا گیا، لیکن بہت سی مثالیں اس کی شاہد ہیں اور بہت سے مواقع ایسے آئے ہیں کہ جب ہٹلر اس نتیجہ پر پہونچنے پہ مجبور ہوا ہے کہ عورت کائنات کی غیر ضروری تخلیق نہیں ہے اور اگر اسے دنیا سے علیحدہ کر دیا جائے تو یہ کائنات عالم یکسر ویران و سنسان نظر آنے لگے۔

ہٹلر نے بہت سی محبتیں کی ہیں، شروع زمانہ میں جو لڑکی اس کے دل و دماغ پر مسلط رہی ہے وہ اسکی بھانجی "گریٹ رابل" (Grete Raubal) تھی، وہ شمالی آسٹریا کے دیہاتی علاقہ کی رہنے والی تھی، ہٹلر اسی زمانہ میں "بطل میونک" (Munich) سمجھا جاتا تھا اسی وجہ گریٹ بھی اس سے بہت محبت کرتی تھی اور اس کے حضور میں سراپا عبودیت بنی ہوئی تھی، ہٹلر کو بھی اس سے بیحد محبت تھی لیکن اس کی وجہ سے وہ کبھی اپنے معمولات میں فرق نہیں ڈالتا تھا، وہ اسے فرطِ محبت سے گیلی کہتا اور گریٹ اسے

"چچا الف" کہتی تھی، ہٹلر کو جب کبھی انتظامی اور جنگی مصروفیتوں سے مہلت ملتی وہ اپنا وقت گیلی کے پاس صرف کرتا اس نے اپنی ایسی بہت سی فرصتیں جب آسمان پر "ملکۂ عرش" بے نقاب ہوتی، تارے شبگیر ہوتے، چڑیاں زمزمہ صبحگاہی چھیڑتی ہوتیں اور موجیں اپنا ساز درست کرتی ہوتیں، اپنی محبوبہ گیلی کے ساتھ گزاریں دنیا نے ان سب باتوں کو دیکھا، لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں لیکن ہٹلر کے آگے کون دم مار سکتا تھا، وہ اب نازیوں کا "انسان اعظم" تھا اسے اس بات سے بیحد کوفت ہوئی کہ کوئی اس کی نجی زندگی سے کیوں واسطہ رکھے، یہ کسی کو نہیں معلوم کہ اس نے اس برہمی کا اظہار "گریٹ رابل" پر بھی کیا یا نہیں لیکن ہاں اتنا معلوم ہے کہ ۱۹۲۸ء کی ایک صبح کو گیلی نے خودکشی کر لی!

اس واقعہ کے بعد سے ہٹلر کے مزاج میں سختی پیدا ہوتی گئی، کیتھرائن نے لکھا ہے کہ گیلی کی خودکشی اسکے مزاج کی "آہنیت" کی بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔ اس کے بعد سے اس کے لب و لہجہ کا کھرا پن اور اسکی طبیعت کی درشتگی بڑھ گئی لیکن ہٹلر نے گیلی کی موت کو بری طرح محسوس کیا اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے جرمنی کے سب سے بڑے نقاش "زیگ لر" کو حکم دیا کہ وہ گیلی کی ایسی تصویر بنا دے جو اس کے نام کو بقائے دوام بخش دے جب وہ تصویر بن کر آئی تو ہٹلر اسکے سامنے انتہائی عجز و نیاز کے ساتھ بے اختیارانہ جھک گیا اور جب اٹھا تو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد ہٹلر کو ایک سینما اسٹار رے نیٹ ملر (Renate Muller) سے محبت ہو گئی، جنرل گوئرنگ نے ایک دعوت کی جس میں ہٹلر کی رے نیٹ سے ملاقات ہوئی جب دعوت ختم ہونے والی تھی اسوقت گوئرنگ ہٹلر کو رے نیٹ کے ساتھ تنہا چھوڑ کر کمرہ سے باہر چلا گیا، معلوم نہیں دونوں میں کیا گفتگو ہوئی اور کن معاملات پر بحث ہوئی لیکن کچھ دنوں کے بعد اتنا ضرور سننے میں آیا کہ رے نیٹ ایک یہودی سے بڑی شد و مد سے محبت کر رہی ہے اور یہ بات ہٹلر اور گوئرنگ دونوں کو سخت ناگوار ہے — گوئرنگ اور اس کے دوستوں نے رے نیٹ کو سمجھایا کہ وہ ایک یہودی سے محبت کر کے بڑی سخت غلطی کا ارتکاب کر رہی ہے انھوں نے اُسے یہ بھی بتلایا کہ یہ صورت خطرہ سے خالی نہیں، رے نیٹ یہ دیکھکر جرمنی سے باہر چلی گئی اور اُس یہودی سے شادی کر لی لیکن اسے جرمنی واپس آنے پر مجبور کیا گیا اور اس پر زور دیا گیا کہ وہ اپنے فلم کے ٹھیکے پورے کرے ورنہ اسے سزا دیجائے گی، جرمنی میں وہ بالکل "اشک داد خواہ" تھی سرتاپا مظلومیت کی تمثیل، آخر اس نے ان زیادتیوں سے تنگ آکر خودکشی کا ارادہ کیا اور ۱۵۰ فٹ کی بلندی سے کود پڑی لیکن عجیب اتفاق تھا کہ وہ مری نہیں، ڈاکٹروں کو اس کی زندگی کی پوری امید تھی لیکن وہ خود اپنی زندگی سے بیزار ہو چکی تھی، اب وہ زندہ رہتی بھی تو اس کے لئے بیکار تھا، آخر ایک دن اخباروں نے اعلان کر دیا کہ رے نیٹ اس دنیا سے رخصت ہو گئی، اسوقت تیسری ریش (Reich) برسر اقتدار تھی — ہٹلر نے اسکے بعد ایک اور لڑکی سے محبت کی اس نے بھی گریٹا اور رے نیٹ کی طرح تاریخی اہمیت حاصل کر لی ہے — اسکی تیسری محبوبہ کا نام "لینی رفنستال" (Leni Riefenstall) ہے اور وہ ایک یہودی لڑکی ہے!! — وہ بویریا کی رہنے والی نہایت حسین و جمیل لڑکی ہے اور اس وقت جرمنی کی ممتاز ترین

ایکٹریسوں میں شمار کی جاتی ہے، اسی یہودی لڑکی اور آمرِ جرمنی میں نہایت شدید محبت ہے، ہٹلر اپنی خستگی دور کرنے کے لئے لینی (Leni) ہی کے نرم و نازک ہاتھ کا متمنی رہتا ہے — ہٹلر اور ایک یہودی لڑکی سے محبت کرے! یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی، دنیا کو اس محبت پر حیرت ہے، وہ یہودیوں کے خون کا پیاسا ہے لیکن اسی مطعون قوم کے ایک فرد کے لئے وہ بیتاب ہے، یہ بات عام لوگوں کے لئے شدید استعجاب کا باعث ہے لیکن عشق و محبت کی دنیا میں سیاسی اور نسلی تعصبات حائل نہیں ہوتے — ایک مرتبہ گوئرنگ نے ہٹلر کو اس حرکت پر بہت ملامت کی، "آپ بہت ہی ناعاقبت اندیشی سے کام لے رہے ہیں۔ اس یہودی لڑکی کو چھوڑیئے، تمام سلطنت میں اس کی وجہ سے چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں" لیکن ہٹلر نے نہایت سختی کے ساتھ جواب دیا "گوئرنگ! میرے نجی معاملات تم سے کوئی سروکار نہیں رکھتے، اگر تم انمیں دخل دو گے تو بڑی گستاخی کرو گے۔ اس بات کو ہمیشہ کیلئے گرہ میں باندھ لو"۔ گوئرنگ نے اسکے بعد دوسری ترکیب سوچی، اس نے لینی کو دھمکایا کہ وہ ہٹلر کا پیچھا چھوڑ دے اور اس کی محبت سے باز آجائے ورنہ اسکی زندگی کو ختم کر دیا جائے گا، ہٹلر کی محبوبہ بھلا کب دبنے والی تھی اس نے صاف صاف کہدیا کہ "گوئرنگ! تم یہ خبط اپنے دماغ سے نکال دو، تمہارا یہ راستہ ہے تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ" — لینی نے اُسی وقت ٹیلیفون کیا اور کہا کہ ہٹلر فوراً یہاں آؤ، مجھے بڑا ضروری کام ہے — ہاں، اور وہ کام تمہارے لئے بھی ضروری ہے" — ہٹلر نے فوراً تعمیل کی، لینی (Leni) اس کو دیکھتے ہی اسکی آغوش میں گر پڑی اور رونے لگی، اُس نے آمرِ جرمنی کو اُن تمام خطرات سے آگاہ کیا جو اُس کی اور ہٹلر کی جان کے لئے پیدا ہو رہے تھے، ہٹلر نے اپنی بھاری آواز میں اُس کو تسکین دیتے ہوئے کہا "لینی! مت گھبراؤ، مجھے اور تمہیں سوائے موت کے اور کوئی چیز علیحدہ نہیں کر سکتی"۔ ہٹلر کی یہ محبت جاری ہے اور اس کی یہود دشمنی بھی اسی طرح برقرار ہے اس محبت کا انجام کسی کو نہیں معلوم اگرچہ سب لوگوں کو اس کا انتظار ہے، ممکن ہے یہ محبت کچھ تاریخی امکانات اپنے اندر پوشیدہ رکھتی ہو اور یہودیوں کے ساتھ وہ جانوروں کا سا سلوک، جو جرمنی کی سرزمین پر روا رکھا جا رہا ہے، کچھ کم ہو جائے، لیکن کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی — اس لئے کہ ابھی چودہ ہزار یہودی محض ایک ہرواں راتھ کے قتل کے جرم میں گرفتار کئے ہیں اُن کے تمام مدارس، معابد، اخبارات، رقص گاہیں تھیٹر اور سینما بند کر دئے گئے ہیں اور اُن کے اوپر جیسا عرصۂ حیات آج جرمنی میں تنگ ہے اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔

خواجہ احمد فاروقی، بی۔اے

فلسفۂ مذہب

اِس کتاب کی اہمیت نام سے ظاہر ہے۔ اسے ملک کے نامور محقق جناب مقبول احمد صاحب نے تالیف کیا ہے۔ اعلیٰ قیمت عہ رعایتی ۱۲ر محصول علاوہ
منیجر نگار بک ایجنسی

باب الاستفسار

خضر — کافر

(جناب سید علی رضا صاحب - دہلی)

یوسف رضا صاحب بدایونی کا ایک مقالہ جوش پر آپ کے رسالہ میں شایع ہوا ہے، اس کے دوسرے حصہ میں انھوں نے بعض اعتراضات بھی کئے ہیں، منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ خضر، نظر اور شرر کا ہم قافیہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ اصل لفظ خِضر یا خَضِر ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ کافر کو سخنور کا ہم قافیہ قرار دیا ہے، حالانکہ صحیح تلفظ اس کا کافِر ہے۔

آپ نے اپنی کوئی رائے ان اعتراضات کی بابت نہیں درج کی۔ براہ کرم مطلع فرمائیے کہ آپ کا فیصلہ اس باب میں کیا ہے۔

(نگار) خضر اور کافر دونوں عربی لفظ ہیں۔ خضر کے تلفظ دو ہیں۔ خِضر بروزن مصر اور دوسرا خَضِر بروزن فعل جس کے معنے ہیں سبز و شاداب کے، لیکن اس غیر معلوم ہستی کے لئے جس کا ذکر موسیٰ کے ذکر کے ساتھ کلام مجید میں آیا ہے اور جسے عوام پیغمبر بھی سمجھتے ہیں، خِضر (بروزن فعل) اور خَضِر (بروزن فعل) دونوں کا استعمال ہوا ہے اس لئے میری رائے میں جوش نے غلطی نہیں کی ہے۔

کافر کے تلفظ کو ہر شخص جانتا ہے کہ وہ بروزن کاہل ہے، لیکن اُردو و فارسی والوں نے کبھی کبھی یہ فتح فا بھی استعمال کیا ہے میری رائے میں اس سے اجتناب اولیٰ ہے، کیونکہ اس میں عامیانہ انداز زیادہ پایا جاتا ہے۔

یہود اور صیہونیت

(جناب اسد اللہ خانصاحب - مرزاپور)

آجکل فلسطین میں یہودیوں کی وجہ سے ہنگامہ برپا ہے اور ہٹلر نے اپنے ملک سے ان کو نکالکر دنیا کی توجہ ان کی طرف پھیر دی ہے - اسی سلسلہ میں صیہونیت کا بھی بار بار ذکر آتا ہے - کیا آپ مہربانی فرماکر یہودیوں کی تاریخ کے متعلق مختصر الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے، نیز یہ کہ صیہونیت کیا چیز ہے

(نگار) یہود سامی النسل قوم ہے جو اسوقت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے - انگریزی میں انھیں ( ) کہتے ہیں جس کے معنے ہیں ( ) اسی کا مترادف ( ) ہے - یہودیوں کی ابتدائی تاریخ توریت میں بیان کی گئی ہے، لیکن آثاری تحقیقات کی بنا پر اس میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہوگیا ہے - اس قوم نے حضرت ابراہیم کی سیادت میں ۲۰۰۰ سال قبل مسیح عراق سے فلسطین ہجرت کی - اس کے ۵۰۰ سال بعد یہ اپنے مویشی لیکر مصر چلے گئے، یہاں ان کو سخت ایذائیں دی گئیں اس لئے حضرت موسیٰ کی سرکردگی میں یہ پھر وہاں سے چلے اور بیابان میں پہاڑوں اور جنگلوں میں آوارہ پھرتے رہے -

جب یہ کنعان پہونچے جسے اب فلسطین کہتے ہیں تو یہاں کی قوموں کو انھوں نے مغلوب کیا اور پھر اسی سرزمین میں آباد ہوگئے جس کو صدیوں قبل یہ چھوڑ چکے تھے - انھوں نے اس حصۂ زمین کو اپنے بارہ قبائل کے درمیان تقسیم کرلیا جو یعقوب کے بیٹوں یا پوتوں کے نام سے موسوم تھے - اس وقت انکا کوئی بادشاہ نہ تھا بلکہ ہر قبیلہ کا ایک سردار ہوتا تھا جو سرپنچ کی حیثیت سے تمام انتظام کرتا تھا - لیکن بعد کو انھوں نے اپنا ایک بادشاہ تجویز کرلیا جس کا نام طالوت ( ) تھا - طالوت کے بعد داؤدؑ بادشاہ ہوئے اور ان کے بعد سلیمانؑ - سلیمانؑ کے عہد میں انکی سلطنت بہت مالدار تھی اور انھیں کے زمانہ میں ہیکل یروشلم تعمیر کی گئی - سلیمان کی وفات کے بعد سلطنت دو حصوں میں منقسم ہوگئی، جنوب میں یہودا ( ) کی اور شمال میں اسرائیل کی ان میں باہم سخت لڑائیاں ہوئیں یہاں تک کہ ۵۸۶ سال قبل مسیح یہودا کی اور ۷۲۱ سال قبل مسیح بنی اسرائیل کی سلطنت ختم ہوگئی اور اہل بابل یہودیوں کو غلاموں کی حیثیت سے گرفتار کرکے اپنے ملک لیگئے طویل زمانہ کے بعد یہ پھر واپس آئے اور حکومت شام کے تحت زندگی بسر کرنے لگے - شام میں اسوقت سلیوکس کی اولاد حکمراں تھی (یہ سکندر اعظم کا مشہور جنرل تھا)

بعد کو مکابیوس کی اولاد نے آزادی حاصل کرکے اپنے آپ کو حکمراں بنالیا - ۶۳ سال قبل مسیح یہودی رومہ کی

حکومت کے متعلق ہو گئے، چنانچہ ولادت مسیح کے وقت جو سب سے بڑے یہودی تھے یہ تمام علاقہ روما کی سلطنت میں شامل تھا۔

۷۰ء میں شہنشاہ طیطوس نے ان کے معبد کو تباہ کیا اور ملک سے باہر کر دیا۔ اسی وقت یہودی چاروں طرف منتشر ہو گئے اور تقریباً ہر جگہ ان کے ساتھ بہت برا سلوک کیا گیا۔ انگلستان سے یہ بارھویں صدی میں نکالے گئے لیکن سترھویں صدی میں پھر واپس آنے کی اجازت دیدی گئی۔ انیسویں صدی میں ان کو برابر کے شہری حقوق بھی مل گئے (اس سے قبل نہ ان کو ملازمت ملتی تھی اور نہ مساویانہ حقوق دوسری آبادی کے مقابلہ میں ان کو حاصل تھے)

۱۹۳۳ء میں سامی النسل لوگوں کے خلاف ایک عام تحریک جرمنی میں شروع ہوئی اور اس کا سبب ہٹلر نے یہ بتایا کہ ملک کی تجارت پر یہ پوری طرح قابض تھے اور اہل ملک کے حقوق تلف ہو رہے تھے، تجارت اور لین دین میں ان کی مہارت ہمیشہ سے ضرب المثل رہی ہے اور اس باب میں ان کی سنگدلی کے واقعات بہت مشہور ہیں، چنانچہ شائی لاک کے افسانہ سے تقریباً ہر شخص واقف ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ان میں بعض بڑے بڑے اہل کمال بھی پیدا ہوئے، مثلاً برگساں۔ ڈسرائیلی۔ السٹین۔ ہین اور اسپنوزا وغیرہ۔

انیسویں صدی میں ایک جدید تحریک یہ پیدا ہوئی کہ یہودیوں کو اپنے اصلی وطن فلسطین میں پھر آباد کیا جائے۔ اس تحریک کا نام (Zionism) ہے جسے عربی میں صیہونیت کہتے ہیں۔ زیون یا صیہون اصل میں اس پہاڑی کا نام ہے جو یروشلم میں پائی جاتی ہے اور اسی لئے مجازاً یہودیوں کو اہل صیہون کہتے ہیں۔ جب جنگ عظیم کے بعد فلسطین ترکوں کے قبضہ سے نکل گیا تو یہ تحریک اور زیادہ قوی ہو گئی۔

۱۹۱۷ء میں (Balfour Declaration) کے ذریعہ سے برطانیہ نے وعدہ کر لیا کہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد کیا جائے گا۔ ۱۹۲۱ء میں اس مقصد کے لئے مستقل فنڈ قائم کیا گیا اور یہودیوں کی آمد فلسطین میں شروع ہو گئی۔ اس وقت دنیا میں ایک کروڑ پچاس لاکھ خالص یہودی پائے جاتے ہیں، لیکن یہودی خون اس سے بہت زیادہ لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ برطانیہ عظمیٰ میں تقریباً تین لاکھ یہودی آباد ہیں، لیکن ان میں وہ لوگ شامل ہیں جنھوں نے برائے نام عیسوی مذہب اختیار کر لیا ہے۔ یہ زیادہ تر شہروں ہی میں پائے جاتے ہیں اور بڑے وسیع پیمانہ پر مختلف قسم کے کاروبار کرتے ہیں۔ دولت کے لحاظ سے کوئی قوم ان کی ہمسر نہیں اور یہی وجہ ان کے ساتھ رعایت کی ہے

ان کا مذہب یکسر رسم و رواج ہے اور حلال حرام کے جھگڑے ان کے یہاں بہت پائے جاتے ہیں، مسلمانوں نے بہت سی باتیں انھیں سے لی ہیں۔ ان کی تقویم بھی علیحدہ ہے، ان کا سال اکتوبر سے شروع ہوتا ہے اور اسوقت ان کا سنہ ۵۶۹۸ ہے۔ ان کی لٹریری زبان عبرانی ہے اور بڑا وسیع لٹریچر اس زبان میں پایا جاتا ہے۔ جس زبان میں گفتگو کرتے ہیں اس کا نام یدیش ہے جس میں متعدد اخبارات شائع ہوتے ہیں۔

راز و نیاز

(ایک شاعر اپنے حقیقی ماحول میں)

جب غم بے انتہا سے دل مرا گھبرا گیا
کسب فرحت کے لئے میں جانب دریا گیا

وقت شب تھا، خامشی کا دلنشیں ہنگام تھا
کارواں در کارواں طاری سکوت عام تھا

ملگئی تھی نور بخش عالم کو ہر غم سے نجات
ایک نقطہ پر سمٹ کر آگئی تھی کائنات

چودھویں کے چاند کی رعنائیاں تھیں بے نقاب
کر رہی تھیں وسعت عالم میں تقسیم شباب

ساحل دریا تک آکر رک گئے میرے قدم
فطرت بیدار تھی آمادۂ لطف و کرم

دیکھ کر آب رواں کو نغمہ ریز و نغمہ بار
ہوگیا حاصل مری آشفتہ حالی کو قرار

چاندنی کی سیمیں شعاعیں چھا رہی تھیں ہر طرف
مستیاں ہی مستیاں برسا رہی تھیں ہر طرف

منچلی ہر موج سے تھیں آئینہ سامانیاں
بڑھتی جاتی تھیں نگاہ شوق کی حیرانیاں

ریت کے ذرے چمکتے تھے ثریا کی طرح
تھا یہاں سب کچھ مرے خواب تمنا کی طرح

اسقدر پر کیف منظر پیشتر دیکھا نہ تھا،
دل جلے تسکین پا سکتے ہیں، میں سمجھا نہ تھا

کثرت جلوہ سے حاصل دل کو سرشاری ہوئی
رفتہ رفتہ روح پر اک محویت طاری ہوئی

ساز دل آخر شعاع ماہ سے مل ہی گیا
میری امیدوں کا پژمردہ کنول کھل ہی گیا

کر دیا جذبات دار فتہ نے فطرت سے قریب
ہوگیا دل میرا انوار حقیقت سے قریب

نطق پیرائی عطا کی جذبۂ خاموش نے
کر دیا گویا مجھے کیفیت پر جوش نے

موج دریا سے رہا تا دیر سرگرم کلام
کر لیا معلوم میں نے راز تسکین دوام

چاند اور تاروں سے کی میں نے مسلسل گفتگو
ہوگئی حاصل مجھے معراج کیف آرزو

رات بھر میخانۂ فطرت کی مے پیتا رہا
چاند کی کرنوں سے اپنے زخم دل سیتا رہا

چن لئے میں نے نئے جلوے حریم ناز سے
ذہن نے بیداریاں پائیں، نئے انداز سے

بارش الہام سے ذہن رسا تاباں ہوا
از سر نو زندگی عشق کا ساماں ہوا

الغرض جاری رہا تا صبح یہ راز و نیاز
ہوگئی آغوش فطرت میں محبت کی نماز

صبح کی آمد حیات نو کا اک عنوان ہوئی
قسمت تاریک جاگی اور نور افشاں ہوئی

نبی احمد بریلوی

کسی کی تصویر سے

یہ کس کی شبیہ دلکش ہے۔ ہاں، یہ تو تمھاری صورت ہے!
یہ رنگ چڑھایا ہے کس نے۔ یہ کس کا خونِ محبت ہے!
یہ ہار بچھایا ہے کس نے۔ شاید یہ کسی کی حسرت ہے!
پاکیزہ نگاہیں کیا کہنا۔ معصوم تبسم کیا کہنا!
ان پیارے پیارے ہونٹوں پر خاموش ترنم کیا کہنا!
الفاظِ خموشی میں بھی نیا اندازِ تکلم کیا کہنا!

تم شمع سے بڑھ کر روشن ہو۔ جلتے ہوئے پروانوں کی قسم!
صہبا سے زیادہ رنگیں ہو۔ چلتے ہوئے پیمانوں کی قسم!
پھولوں سے زیادہ دلکش ہو۔ فطرت کے گلستانوں کی قسم!
لو آؤ کہ اب میں تم سے کچھ اظہارِ حقیقت کرتا ہوں
یعنی کہ لبِ خاموش کو اب رسوائے شکایت کرتا ہوں
کچھ سہمے سہمے لفظوں میں تشریحِ محبت کرتا ہوں!!

ہم دونوں محبت کی بستی بچپن میں بسایا کرتے تھے
مٹی کے گھروندے دریا کے گھاٹوں میں بنایا کرتے تھے
ہم تم سے لڑکپن میں اکثر شادی بھی رچایا کرتے تھے!!
معصوم محبت سے ہم کو کچھ اُنس سا ہوتا جاتا تھا،
دل میٹھے میٹھے خوابوں میں راتوں کو کھوتا جاتا تھا،
تھی کچھ نہ خبر اور بیج کوئی الفت کے بوتا جاتا تھا!!

اچھا ہے میں تم سے مل نہ سکوں اچھا ہے کہ مجھ سے دور رہو
میں ملنے سے مجبور رہوں۔ تم ملنے سے مجبور رہو
تم دور رہو۔ یا پاس رہو آباد رہو مسرور رہو

سلام مچھلی شہری

وجدانیات وجد

(سکندر علی وجد)

آنکھوں سے عیاں ہے تری اے جانِ تمنا
چھپتا ہے کہیں خونِ شہیدانِ تمنا

اُلفت میں شکستوں پہ شکستیں ہوئیں لیکن
چھوٹا نہ کبھی ہاتھ سے دامانِ تمنا

اے یاس یہ شعلہ نفسی چھوڑ خدارا!
برباد نہ ہو جائے گلستانِ تمنا

آسائشِ دائم مجھے درکار ہے یارب!
بجھتی بھی نہیں شمعِ شبستانِ تمنا

ہے وجد عبث دعوۂ اخفائے محبت
آنکھوں میں سماتا نہیں طوفانِ تمنا

فیضِ اثر سے عشق کے دل کا عجیب رنگ ہے
دولتِ حسن کے لئے سارے جہاں سے جنگ ہے

قوتِ سیل سے نہ ڈر، موج سے کھیل بے خطر
ساحلِ پرسکوں مگر تیرے لئے نہنگ ہے

موت ہے ایسی زندگی جس میں خلش نہیں کوئی،
کوئے جفا کشی میں جی، عرصۂ عیش تنگ ہے

دولتِ صبح و شام لے، وقت کی باگ تھام لے
دستِ جنوں سے کام لے، پائے خرد میں لنگ ہے

وجد پہ اہلِ گلستاں، آج یہ راز ہے عیاں
عشق سحاب درفشاں، حسن سراب رنگ ہے

افکار کاوش

(کاوش حیدرآبادی)

کاٹی تمام عمر غمِ زندگی کے ساتھ
اپنی تو دو گھڑی بھی نہ گزری خوشی کے ساتھ

ڈرتا ہوں وضع کی ہو نہ کوئی نئی جفا
تم اور یہ التفات میری بیکسی کے ساتھ!

ساقی! تری نگاہ کے صدقے پلائے جا
وابستہ زندگی ہے اسی بیخودی کے ساتھ

اُن کی نگاہِ ناز نے لے لی متاعِ ہوش،
اپنی خوشی بھی ہو گئی اُن کی خوشی کے ساتھ

آنکھوں میں انتظار کا عالم لئے ہوئے
دنیا سے جا رہا ہوں میں کس بیکسی کے ساتھ

کاوش! کمالِ ضبط کا انجام کچھ نہ پوچھ
کیا جانے کتنے اشک ہیں میری ہنسی کے ساتھ

جذباتِ کیف

(کیفی چریاکوٹی)

جہاں اک اک قدم پر ہے متاعِ زندگی اپنی
کوئی کہہ دے کہ اُس کوچے سے ہم کیونکر گزر جائیں؟

کوئی مستوں سے آکر سیکھ لے آدابِ میخانہ
کہ بیخود ہو کے ٹکرائیں اور سب سے بچ کر جائیں

لبوں پر دم رُکا ہے رہ گرائے بزمِ امکاں کا
تمہارا حکم کیا ہے اب ہی بڑھیں ہم یا ٹھہر جائیں

ہوائے تندِ آزادی میں جانِ مضطرب گم ہے
نشیمن کی طرف جائیں تو میرے بال و پر جائیں

جسے منزل سمجھ کر چل پڑے تھے، وہ نہیں ملتی
اگر جائیں تو ہم اب کس طرف اے ہم سفر جائیں

لطافت، طرزِ خود بینی میں پیدا ہو نہیں سکتی
اڑے رُخ سے جو رنگِ زندگانی، ہم نکھر جائیں

گریباں گیر ایماں، کفر ہے دامن کشاں کیفی،
نگاہِ مست جس پر ڈال دیں وہ ہم اُدھر جائیں

عذاب

(کاوش)

رات کی بزم ہے سکوت فروش
کروٹیں لے رہی ہے روحِ سروش

رقصِ تاروں میں ہے بحدِ جمال
حسن اور عشق میں ہے قیل و قال

ذوقِ سرمایہ دار ہے مسرور
گنگنا تا ہے جذبۂ مفرور

ہنس رہے ہیں ایاغ عبرتِ رنگ
رو رہی ہے نگاہِ حسرتِ رنگ

سو رہا ہے سڑک پہ اک مزدور
گرسنہ، مضمحل، صبور و شکور

کیا بھیانک ہے منظرِ خوں ریز،
آج بھی ہیں زمانہ میں چنگیز

ایک پستی میں اک بہ اوجِ کمال
گل ہے شمعِ دماغِ فکر و خیال

خون رو اے نگاہِ شعرِ حیات
جگمگا اے رہِ خرامِ نجات

یہ ہمارے خدا کا ہے انصاف
فاقہ کش! جاگ! یہ ہے وقتِ مصاف

ٹوٹ اے برقِ انقلابِ خراب
ابتو دیکھا نہ جائے گا یہ عذاب

حضور!

فقیہِ شہر کا تکرار و بحث شغل ہوا
تہی نمی سے ہے اب صوفیار کے دل کا سرور

گریز راہبِ بے چارہ کو جہان سے ہے
کلیم چھوڑ چکا آرزوئے جلوۂ طور

ازل کا نور ہے زیرِ نقابِ خاک ابھی
تلاش کر نہ سکا اس کو فلسفی کا شعور

ہے شاعروں کے خموں میں فقط شرابِ دروغ
غزل سرا ہے، سو اپنی نوا سے بھی ہے نفور

حرم کے شیخ کو اپنا پتا بھی مل نہ سکا
عجم کے دیر نشیں کعبۂ جمال سے دور

کوئی سبو نہ کسی ہاتھ میں نظر آیا
کہ جس میں سوزِ محبت کی ہو شرابِ طہور

کسی کی آنکھ میں ایسی نظر نہیں باقی!
اثر ہے جس کے ترے غیب میں عیاں او "حضور"

نعیم صدیقی

آئندہ جنوری ۳۹ء کا نگار

یعنی مصحفی نمبر طیار ہے

اور اپنی جامعیت کے لحاظ سے اُردو شاعری کی تاریخ میں بالکل پہلی چیز ہے — مصحفی کا مرتبہ اسوقت تک لوگوں نے نہیں پہچانا اور اب بالکل پہلی مرتبہ آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ کیسی غیر معمولی ہستی تھا۔

مصحفی کے غیر مطبوعہ دواوین اور غیر مطبوعہ مثنویوں کا انتخاب — مصحفی کی غزلیات پر بالکل جدید اُصول انتقاد کے لحاظ سے تفصیلی تبصرہ — مصحفی کے شاگردوں کے متعلق ایک عالمانہ ریسرچ — مصحفی کے تذکروں اور دیگر تصانیف پر ایک فاضلانہ انتقاد — اور اسی طرح کے بہت سے عنوانات پر بے مثل مضامین آپ کو اس نمبر میں نظر آئیں گے ضخامت کا اندازہ ۲۰۰ صفحات کیا گیا ہے لیکن ممکن ہے اس سے بڑھ جائے غیر خریداران نگار کے لئے اس نمبر کی قیمت دو روپیہ مقرر ہے — اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو خریداری کے سلسلہ کو جاری رکھئے تاکہ یہ نمبر آپ کو مل سکے۔

منیجر نگار لکھنؤ